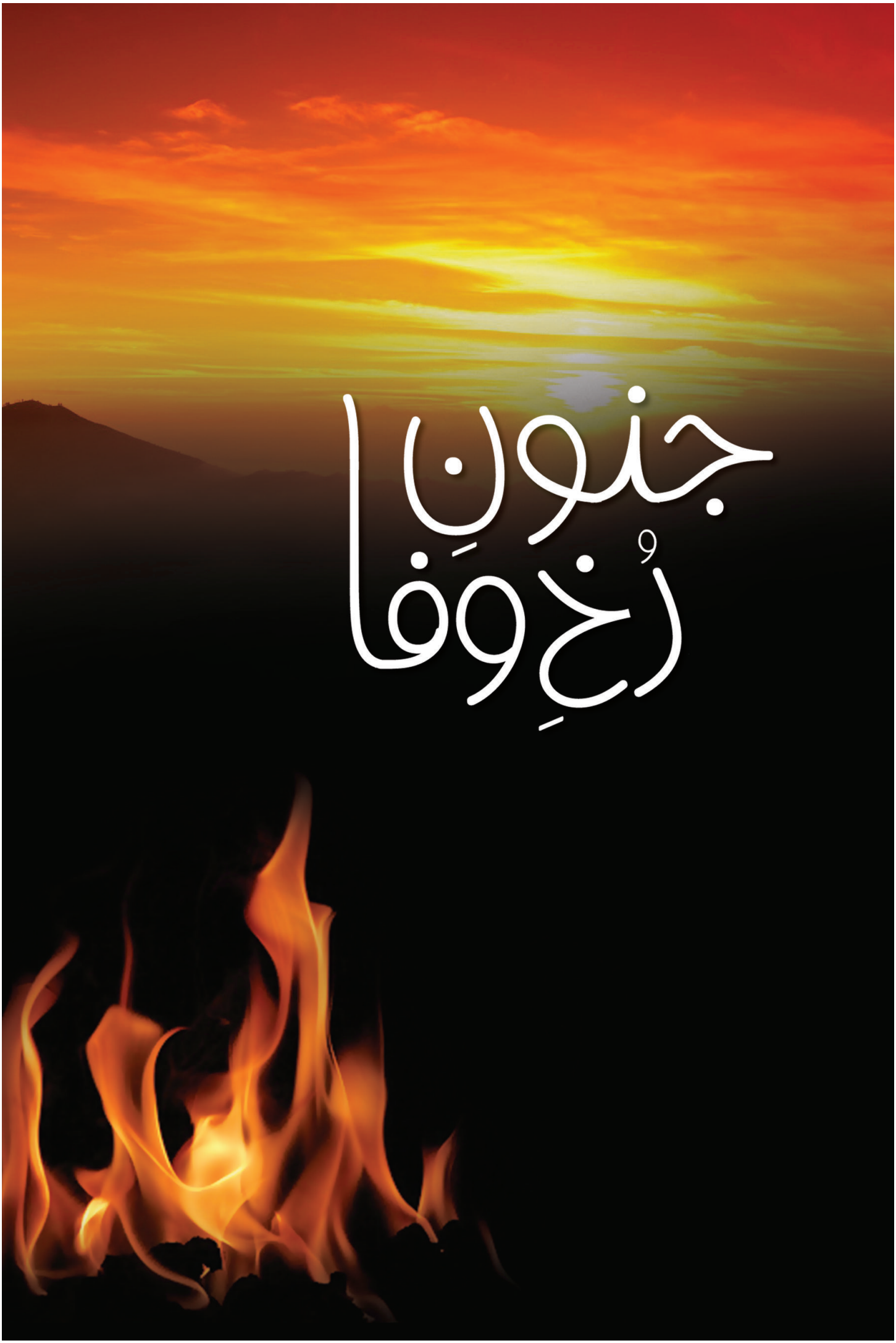

جنونِ
رُخِ وفا

جنونِ رُخِ وفا

ناشر

ہلال پبلیکیشنز، ہلال روڈ، راولپنڈی کینٹ

جملہ حقوق بحق شعبہ تعلقات عامہ افواجِ پاکستان محفوظ ہیں

اشاعت : 2018ء

کتاب : جنونِ رُخِ وفا

ISBN-978-969-7632-01-5

تصنیف : شعبہ تعلقات عامہ افواجِ پاکستان، بلال روڈ راولپنڈی

فون:051-9271617

ای میل:ed.urdu@hilal.gov.pk

قیمت : 500روپے

مطبع : پاکستان پوسٹ فاؤنڈیشن (پریس ڈویژن)، اسلام آباد

فہرست

حرف آغاز

1.	کس بازار سے لاؤں یہ جنس گراں مایہ؟	شیریں حیدر	8
2.	قوم کے بیٹے	محمد امجد چوہدری	14
3.	یہ کون سخی ہیں	بشریٰ رحمن	17
4.	وردی کا ڈی این اے	انوار ایوب راجہ	21
5.	سپاہیوں کا سپاہی	لیفٹیننٹ کرنل ذیشان فیصل خان	25
6.	تابندہ تر ہے تم سے جہانِ وطن کا نام	ڈاکٹر محمد اجمل نیازی	28
7.	سعادت کی زندگی شہادت کی موت	نغمہ اشرف	31
8.	وہ جس کے بنا گھر ہوا سونا سونا	ام شرجیل	35
9.	من جانباز م کا آکاش	محمد امجد چوہدری	42
10.	جان سے بھی پیارا	اہلیہ لیفٹیننٹ کرنل انور عباس	50
11.	سرفروش	زرمینہ مغل	57
12.	ضربِ عضب کے اولین شہداء	لیفٹیننٹ کرنل عارف محمود	64
13.	میرا بھائی۔میرا فخر	مہرین رانی	73
14.	شہادت تیرا عنوان زندگی	سعدیہ ریاض راجہ	77
15.	قضا سے پنجہ کش ہوا باز	لیفٹیننٹ کرنل عارف محمود	80
16.	شکریہ۔۔۔۔پاک فوج	خدیجہ محمود	89
17.	تم ہی سے اے مجاہد وجہاں کا ثبات ہے	گروپ کیپٹن مشکور حسین	93
18.	شہید اعتزاز حسن	لیفٹیننٹ کرنل محمد شفیق ملک	96
19.	اکلوتا شہید بھائی	مریم ارشاد	101

20.	سیاچن، گیاری اور ریڈیو پاکستان	کورثمرین	104
21.	ٹائیگرز آف کے کے ایچ	لیفٹیننٹ کرنل عارف محمود	112
22.	بابا سے بات کرائیں	کرنل عقیل احمد	128
23.	جو چلے تو جاں سے گزر گئے	لیفٹیننٹ کرنل عارف محمود	136
24.	لہو کا خراج	میجر ارمغان نعیم	145
25.	وہ جو راہِ حق کے مسافر ہوئے	عائشہ طیب	151
26.	ایک فضائی محافظ	محمد شاہد	154
27.	ہے شوق شہادت کس قدر	لیفٹیننٹ عاصم ناز	157
28.	نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی	جویریہ صدیق	161
29.	یہ خاکِ وطن ہے جاں اپنی	جویریہ صدیق	165
30.	پھر تیرا رختِ سفر یاد آیا	شوکت نثار سلیمی	170
31.	حق کا مال تھا، حق ادا کر گیا	حمیرا شہباز	176
32.	جانثارانِ وطن	ونگ کمانڈر (ر) عاطف منصور	180
33.	مجھے مار دیجیے	لیفٹیننٹ کرنل عارف محمود	184
34.	پانچ سال کی کہانی	اہلیہ کیپٹن عاصم کریم شہید	193
35.	پھر کسی بچھڑے مسافر کی کہانی لکھنا	جبار مرزا	196
36.	لیفٹیننٹ طیب سے لیفٹیننٹ ارسلان تک	بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) فیصل مسعود	201

انتساب

راہِ وطن کی راہگذاروں پر چلنے والے

اُن وفا پرست سرفروشوں کے نام

جنہوں نے حرمت، حُریت، محبت اور

شہادت کے علم ہر حال میں بلند رکھے

حرفِ آغاز

تحریکِ پاکستان کی شمع شہداء کے لہو سے روشن ہوئی اور اس نے آگے چل کر وہ چراغ جلائے جن کی روشنی میں مسلمانانِ برِصغیر نے آزادی کی منزل حاصل کی۔ آزادی کی قیمت مسلمانوں نے اپنا خون دے کر چکائی بہت سے گمنام افراد اس نعمت کے حصول میں اپنی جانیں قربان کر گئے مگر اللہ کے وعدے کے مطابق وہ زندہ ہیں، شاد ہیں۔ ان کے لہو سے آزادی کی شمع آج بھی روشن ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قیام پاکستان کے بعد سے پاکستان کے خلاف سازشوں کا جو آغاز ہوا ان کی کوئی انتہا نہیں لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ہماری قوم کی جہدِ مسلسل اور افواج پاکستان کے افسروں اور جوانوں کا جذبۂ حب الوطنی، جرأت، بہادری اور جسم و جاں کی قربانی دشمن کے عزائم کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹ بن گئیں۔ کئی روشن چہرے وطن کی حرمت پر قربان ہو گئے۔ ان کی جدائی کا درد آج بھی ہم سب محسوس کرتے ہیں، ان کے محسن چہرے آج بھی ہماری قومی تاریخ کا حسن و نکھار ہیں۔ ان کی مثالیں، یادیں، تصویریں اور نشانیاں ہمارا سرمایہ افتخار ہیں۔ جب مشکل گھڑی آن پڑتی ہے، انہی کے چہرے ہم میں جرأت و حرارت پیدا کرتے ہیں اور نامساعد حالات میں حوصلہ بخشتے ہیں۔ ناامیدی میں وہ امید کی کرن ہیں اور جب وطن کی آزادی اور آن بان کے لئے قربانی دینے کا وقت آ پہنچتا ہے تو انہی کے نقوش ہمیں میدان کارزار میں اتار کر وہ جوش اور جذبہ عطا کرتے ہیں کہ دشمن کے دلوں پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔

عزم استقلال اور ایثار وقربانی کا یہ سلسلہ جاری وساری ہے اسی کے دم سے آزادی کی شمع ہمیشہ روشن رہے گی۔ وطنِ عزیز کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بھی افواجِ پاکستان کی قربانیاں ناقابلِ فراموش ہیں۔ آپریشن شیر دل سے لے کر راہِ راست، راہِ نجات، ضربِ عضب اور اب ردالفساد تک ہم نے ایک ایک انچ کی قیمت اپنے لہو سے ادا کی ہے۔ قوم کا ہر فرد انمول قربانیوں کا معترف ہے اور انہیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔ افواج پاکستان کے ماہنامہ ''ہلال'' کا اُفق قومی پرچم کو سربلند رکھنے والے ان ستاروں سے جگمگا رہا ہے۔ ان کی روشنی کو نوجوان نسل تک پہنچانے کے لئے ہلال پبلیکیشنز نے ایک کتابی سلسلہ شروع کیا ہے۔ جس کی ایک کاوش ''جنونِ رُخِ وفا'' کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ ''جنونِ رُخِ وفا'' میں وطن کی حرمت اور آزادی پر قربان ہونے والے تمام شہداء اور غازیوں کا عکس دیکھا اور خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے۔ یقیناً ان کے کارنامے ہماری نوجوان نسل میں وہ جذبہ پیدا کریں گے جس کے ذریعے وہ بڑی سے بڑی مشکل اور کڑے سے کڑے امتحان میں سرخرو ہوں گے اور ان کی پرواز ہمیشہ بلند رہے گی۔

میجر جنرل آصف غفور

ڈائریکٹر جنرل

انٹر سروسز پبلک ریلیشنز

23 مارچ 2018ء

کس بازار سے لاؤں یہ جنس گراں مایہ؟؟

شیریں حیدر

.....•••.....

آرمی آڈیٹوریم کی اگلی چند قطاروں میں سے ایک پر میں اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھی تھی، مجھے اپنے چینل کی طرف سے اس اہم دن کے پروگرام کی کوریج کے لئے بھیجا گیا تھا-میری شادی کو سات برس ہو چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بیٹے کے نقصان کے بعد دو صحت مند بیٹوں سے نواز رکھا ہے۔ پیدائش کے چند منٹ کے بعد ہی میرے پہلوٹھی کے بیٹے نے گنتی کی سانسیں لے کر جان دے دی تو میں صدمے کے کوہ گراں تلے دب گئی، جلد ہی اللہ نے مجھے اگلے تین برسوں میں دو بیٹوں سے نواز دیا۔اب وہ دونوں سکول جاتے ہیں اور میں اپنے ملازمت کے شوق کو جاری رکھے ہوئے ہوں۔اس روز بھی ایسا ہی دن تھا جب مجھے طویل وقت کے لئے بچوں کو اپنی اماں کے ہاں چھوڑنا پڑا تھا۔

اسد.... میرے شوہر، ایسے مواقع پر بہت تنگ پڑتے تھے مگر مجبوری کہ انہیں میرے ساتھ آنا پڑتا تھا کہ واپسی پر بسا اوقات اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ گھر اکیلے جانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔شروع سے ہی پروگرام کا رنگ ایسا جما کہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔پروگرام اپنے آخری مراحل میں داخل ہو رہا تھا جب اعلان ہوا، ''تن تنہا.... ایک اہم اور مشکل ترین محاذ پر دشمن کو تین گھنٹے تک فائرنگ کے تبادلے میں مصروف رکھا، دشمن کو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ مقابلے پر کم از کم ان کے برابر طاقت کی کمپنی ہوگی۔اس وقت تک جب تک کیپٹن بلال کے پاس آخری گولی تک ختم نہ ہو گئی۔اس کے بعد وہ اپنے پوشیدہ ٹھکانے سے دوبدو لڑائی کے لئے نکلے.... دشمن کے ایک مارٹر گولے کو سینے پر سہا، کیپٹن بلال علی شہید!!!'' آڈیٹوریم کی بڑی سکرین پر ایک

سمارٹ چہرہ ابھرا، تازہ تازہ شیو کرنے سے ہلکی ہلکی نیلاہٹ لئے ہوئے چہرہ۔ ''یہ کیپٹن بلال کی بعد از شہادت کی تصویر ہے .... '' کمپیئر کی آواز ابھری، ''یہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر اس وقت بھی تھی جب دھرتی ماں کے سینے میں اس کے لہو کا آخری قطرہ بھی اتر چکا تھا۔''

میرے سینے میں دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہوئی.... ''کس ماں کا لال تھا، اس کی ماں کا کیا حال ہوگا؟'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

''اب میں سٹیج پر اس مادر وطن کے عظیم رکھوالے کی عظیم ماں کو بلاتی ہوں.... '' اناؤنسمنٹ ہوتے ہی بیک گراؤنڈ میں موسیقی ابھری، ''ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے.... '' ہال میں موجود فوج کے اعلیٰ ترین عہدے دار اپنی نشست سے کھڑے ہوگئے اور ان کی اہلیہ ان کی تقلید میں کھڑی ہوئیں تو سب لوگ اپنی نشستوں سے کھڑے ہوگئے اور تالیوں کی گونج تھی کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہم بھی کھڑے تھے، ہمارے سامنے لمبے لوگ کھڑے تھے اس لئے منظر واضح نہ تھا، فقط روشنی نظر آرہی تھی، جلد ہی سب لوگ بیٹھ گئے اور پھر میں نے دیکھا کہ سٹیج کی ایک طرف سے سیڑھیوں پر سج سج کر قدم اٹھاتے ہوئے .... وہ کیا تھی، کوئی عورت، فرشتہ یا حور.... چہرے پر اتنا نور کہ نظر ہی نہ ٹھہرتی تھی.... سرتاپا نور کا ہالہ تھا، سفید دوپٹہ، سفید بال، سفید لباس اور چہرے پر سوگواری کے ساتھ ایسا نور کہ میں نے اپنی عمر میں ایسا چہرہ نہ دیکھا تھا۔ جس شعبے سے میرا تعلق ہے وہاں بھی ہر روز ہر طرح کے چہروں سے واسطہ پڑتا ہے اور ان میں سے بہت سے چہروں پر میک اَپ کی تہیں چڑھی ہوتی ہیں، پھر بھی ان میں سے کسی میں ایسی خوبصورتی نہیں آتی۔

''بلال علی..... میرا اکلوتا لال..... آپ سب کا لال، دھرتی ماں کا لال، جسے دھرتی ماں نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے، وہ یہاں بھی موجود ہے، ہم سب کے درمیان، ہم سب کو دیکھ کر مسکرا رہا ہوگا، بالکل اسی طرح.....'' مڑ کر انہوں نے سکرین پر نظر آنے والے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔ ہال میں موجود ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ''میں بیس سال کی عمر میں بلال علی کی ماں بنی..... بائیس

برس کی عمر میں اس کے شہید باپ کی بیوہ اور چند دن قبل پینتالیس برس کی عمر میں ایک شہید کی ماں!'' سر کے چاندی جیسے سفید بال دیکھ کر لگتا تھا کہ ان کی عمر زیادہ ہوگی مگر چہرے سے عمر کا اندازہ نہ ہوتا تھا۔ ''اس نے زندگی میں کبھی مجھے سفید لباس نہ پہننے دیا کہ میں خود پر رنگ حرام نہ کر لوں، اپنی مرضی سے مجھے پیارے پیارے رنگوں کے ملبوسات زبردستی پسند کر کے خریدواتا، کیا آپ یقین کریں گے کہ بلال علی کی شہادت کی خبر سن کر.....اس کے شہید چہرے کو دیکھنے کے وقفے کی رات میں میرے سر کے سب بال سفید ہوگئے تھے.....تب میں نے پہلی بار مکمل سفید لباس پہنا اور اب رنگ پہننے کو دل نہیں چاہتا.....'' ہلکی سی سسکی کی آواز مائیک میں سے ابھر کر آڈیٹوریم میں بیٹھے ہر شخص کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

''بلال صرف میرا نہیں.....آپ سب کا بیٹا تھا اور ہے، اس کا عزم یہی تھا کہ اس مٹی کو دشمن کے ناپاک قدم اس کی زندگی میں نہیں روند سکتے.....اور اس نے اپنا عزم پورا کیا.....کیا نا؟؟؟'' سوال تھا یا نوحہ، جو اُن کے سینے کی گہرائی سے نکلا اور ہم سب کے سینوں میں تیر کی طرح ترازو ہو گیا۔ ''میں نے اپنی ساری زندگی اس بات میں صرف کر دی کہ بلال کو ایک اچھا انسان بناؤں، اس کے دل میں مادر وطن کی محبت لہو کی طرح دوڑتی تھی کیونکہ میں نے اسے بتایا تھا کہ جو شخص اپنی ماں سے محبت نہیں کرتا، وہ کسی سے محبت نہیں کر سکتا.....میں نے اسے بتایا کہ سب سے پہلی ماں مادر وطن ہوتی ہے.....اس سے محبت میں ہماری بقا ہے!''

تالیوں کی گونج دیر تک جاری رہی.....

''وہ ہمیشہ کہتا تھا، ماں میرے سر پر سہرا سجانے کے خواب نہ دیکھا کریں.....میرے سر پر شہادت کا تاج سجے گا، اور اس نے یہ تاج اپنے سر پر سجا لیا ہے.....'' گہری سانس لینے کے لئے چند لمحوں کا توقف ہوا۔ حاضرین ہمہ تن گوش تھے.....اس عظیم ماں کے دل کا حال سننے کو بے تاب، شاید وہ یہ سننا چاہتے تھے کہ ماں کے لبوں سے یہ سننے کو ملے گا کہ بیٹے کی جدائی میں ماں کے دل کا کیا حال تھا۔ شاید سب سوچ رہے تھے کہ ایک ماں کے دل سے یہ سننے کو ملے گا کہ کاش وہ اپنے

بیٹے کو فوج میں نہ جانے دیتی۔

''آپ کے شوہر شہید ہوئے .....وہ بھی کیا فوج میں تھے؟'' کمپیئر نے لوگوں کے اذہان کو زبان دے دی، ''اگر وہ فوج میں تھے اور اپنے فرائض کی ادائیگی کے دوران شہید ہوئے، پھر بھی آپ نے بلال علی کو بچپن سے مادر وطن سے محبت اور اس کی حفاظت کا درس سکھایا .....کبھی سوچا کہ کہیں اکلوتے لال کی جدائی بھی نہ برداشت کرنی پڑے، کبھی اشارہ ہوا کہ بیٹے کی جدائی بھی برداشت کرنا پڑے گی؟''

''اللہ کا بڑا کرم ہے .....اس نے مجھے ایک شہید کی بیوہ بنایا اور ایک شہید کی ماں ..... یوں تو اس ملک کا ہر محافظ ہم سب کا بیٹا ہے .....بلال علی، میں سمجھتی ہوں کہ اسی طرح آپ سب کا بھی بیٹا ہے، اس کے سارے دوست اور ساتھی میرے بیٹے ہیں، مجھے اپنے بیٹے کی خوشبو اور اس کا لمس اپنے اردگرد محسوس ہوتا ہے! مجھے لگتا ہے کہ ہر روز اپنے معمول کی طرح رات کو سونے سے قبل وہ میرے کمرے میں آتا ہے، میں نیم خوابیدہ ہوتی ہوں، وہ میرے پاؤں چھوتا ہے اور دیر تک کھڑا رہتا ہے، پھر وہ مجھے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے، میں سو جاتی ہوں، دن بھر بھی وہ مجھے گھر میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے ..... کہتے ہیں کہ شہید زندہ ہوتا ہے، آپ لوگوں میں سے زیادہ تر شہداء کے والدین ہیں .....''عورتوں کے آنسوان کی پلکوں کے بند پر نہ ٹھہر رہے تھے۔

یوم شہداء کی اس تقریب میں زیادہ تر شرکاء وہ تھے جنہوں نے اپنے کسی نہ کسی پیارے کو وطن کی حفاظت کرتے ہوئے کھویا تھا۔

''جس نے اس بات کا تجربہ حاصل نہیں کیا اسے اندازہ نہیں مگر یہاں پر موجود ہر شہید کے وارث کو میری بات کی سچائی کا اندازہ ہوگا کہ شہید واقعی زندہ ہوتا ہے ..... میں نے کبھی نہیں سوچا کہ بلال علی کو فوج میں نہ بھیجتی .....دکھ تو یہ ہے کہ میرے پاس اپنی مادر ملت کے حوالے کرنے کے لئے فقط ایک بلال تھا، اللہ کی قسم اگر میں نے دس بلال پیدا کر کے پالے ہوتے .....تو بھی انہیں مادر وطن کی محبت کا درس دے کر .....امانت اللہ کے حوالے کر دیتی، میں تو کم نصیب ہوں کہ ایک

ہی چراغ جلاسکی جورہتی دنیا تک میرے وطن کی ہر شمع کومنور رکھے گا..... اگر میرے دس بلال اللہ کی راہ میں لڑتے ہوئے شہید ہوتے تو میں تب بھی خود کوخوش نصیب کہتی، میرے لال ..... میرے بلال کی دلی خواہش پوری ہوئی..... مجھے اس بات پر فخر ہے کہ جب فرشتے میرے زندہ بلال کو لے کر جنت میں گئے ہوں گے تو اللہ نے کہا ہوگا کہ کیسی خوش نصیب ماں ہے جس نے اس لال کو جنم دیا....." سسکی سے زیادہ مجھے اس ماں کی آواز نہ آئی تھی، فاصلہ زیادہ تھا، مگر کیمرہ بار بار اس عظیم ماں کا کلوزاپ دکھا رہا تھا جس کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت بہہ رہے تھے۔

"میرے پیارے نبی پاک ﷺ نے اٹھ کر میرے بلال کا استقبال کیا ہوگا..... میں تو وہ خوش نصیب ہوں کہ میرے شوہر اور میرے بیٹے کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہے گا..... کل کوئی چوک..... کوئی سڑک میرے بیٹے کے نام سے منسوب ہوجائے گی، وہاں سے گزرنے والے ہر شخص کی نظر بلال علی کے نام کی تختی پر پڑے گی، کوئی اسے دل سے دعا دے گا، کوئی اس کی بہادری کے کارنامے کو دس لوگوں میں بیان کرے گا، بس مجھے یہی چاہئے کہ میرے شہیدوں کا نام زندہ رہے، ان کی قربانیوں کو رہتی دنیا تک یاد رکھا جاتا رہے....." اپنی بات پوری کر کے وہ مبہوت کھڑی تھیں، روشنیوں کا سیلاب تھا سٹیج پر جنہوں نے ان کے منور وجود کو مزید منور کر رکھا تھا۔ ایک بار پھر سب لوگوں نے کھڑے ہو کر داد دی۔

"میری دعا ہے کہ میرے ملک کا نام اور وجود رہتی دنیا تک زندہ رہے..... پاکستان زندہ باد!!!" پر جوش آواز میں انہوں نے مائیک میں کہا۔ کسی شاعر نے کہا تھا، "ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے....."

"میں کہتی ہوں کہ یہ جنس گراں مایہ ہے..... یہ اور ہی دنیا کے باسی ہیں، انہی کو اقبال نے پراسرار بندے کہا تھا کہ جن کا ذوق اور شوق اس دنیا سے ہٹ کر ہے..... ان کے خوابوں کی شہزادی..... شہادت ہے، انہیں جام شہادت کی طلب ہوتی ہے اور کسی چیز کی نہیں..... نہ شہرت کی نہ نام کی، ہمارا ملک اس میں خود کفیل ہے..... کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ اس دھرتی میں اگر کچھ بھی

ہے تو انہی شہیدوں کی قربانیوں کا ثمر ہے ....." تالیاں رکنے میں ہی نہ آ رہی تھیں۔

"بلال علی ..... تمہیں یقین ہونا چاہئے کہ تمہاری ماں تم سے پیار کرتی ہے ..... تمہاری دھرتی ماں تمہاری قربانی کے عوض تم پر صدقے واری جا رہی ہے ..... یہ سب لوگ جو کھڑے ہو کر تمہاری ماں کو عزت دے رہے ہیں، یہ عزت تم نے ماں کو دلوائی ہے ..... آج یہاں ہر ماں اس بات کا عہد کرتی ہے میرے لال ..... ہر ایک ماں، جتنی مائیں یہاں موجود ہیں، سب اپنے اپنے لال، پال پوس کر اپنی دھرتی ماں پر قربان کر دینے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ جس طرح ایک بیج سے پودے اور درخت بنتے ہیں، اسی طرح ہم نے شہیدوں کی وہ فصل بوئی ہے کہ ہر جوان شہادت کی خواہش کرتا ہے ..... کیا آپ سب مائیں ..... اس ملک کی خاطر اپنے اپنے لال قربان کرنے کو تیار ہیں؟ تیار ہیں نا؟" ان کا سوال ہم سب ماؤں کے لئے تھا ..... پس منظر میں ہلکی ہلکی سی موسیقی چل رہی تھی، اے وطن پیارے وطن، پاک وطن، پاک وطن .....

کیا میں اپنے لال کو وطن پر قربان کرنے کو تیار ہو جاؤں گی، کیا اپنے بیٹے پال پوس کر یوں لٹا دینے کا حوصلہ ہے مجھ میں؟ میں نے خود سے سوال کیا، میں تو آج تک راتوں کی تنہائیوں میں اٹھ کر اس بیٹے کو یاد کر کر کے روتی ہوں جس کے نصیب میں فقط چند سانسیں لینا ہی لکھا تھا ..... ہرگز نہیں ..... مجھ میں ایسا حوصلہ نہیں جیسا ان ماؤں میں ہے ..... جو ساری دنیا کے سامنے کہتی ہیں کہ ان کے بیٹے کی شہادت ان کے لئے اعزاز ہے! نہ ایسے بیٹے عام ہوتے ہیں نہ ایسی مائیں ..... ان ماؤں کی عظمت کو سلام ..... ایسی مائیں بھی جنس گراں مایہ ہیں!!

*****

قوم کے بیٹے

محمد امجد چوہدری

.....•••.....

فوجی جوانوں کا ایک جتھہ سبز ہلالی پرچم میں لپٹے شہداء کے تابوت اپنے کاندھوں پر اٹھائے مخصوص فوجی انداز سے آگے بڑھ رہا تھا۔تیز ٹھنڈی ہوا کی سنسناہٹ نے ماحول کو کافی پراسرار بنا دیا تھا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا شہیدانِ وطن کو سلامی دیتا گزرا تو ان کے تابوتوں پہ لپٹے سبز ہلالی پرچم لہرا اٹھے اور ان کی تہوں سے نکلنے والی مسحور کن مہک نے وہاں موجود ہر کسی کو اپنے دام میں لے لیا۔ ہر کوئی شہداء کی عظیم قربانی کو خراجِ تحسین پیش کرنے لگا۔ان کے کارناموں نے حاضرین کے لہو میں حرارت بھر دی تھی۔شہداء نے اپنے لہو سے آزادی کے پیڑ کو سینچا تھا، دھرتی کے کونے کونے کو سرسبز و شاداب کر دیا تھا۔

فوجی جوانوں کی ٹولی گراؤنڈ کے وسط میں پہنچ کر رک گئی۔انہوں نے اس احترام اور احتیاط سے تابوت زمین پر رکھے جیسے ماں اپنے ننھے بچے کو پالنے میں اتارتی ہے اور سرسراتے قومی پرچم کے بیچ شہداء کے یونیفارم اور میڈل سجا دیئے اور ایک طرف صف آرا ہو گئے۔

سورج کی کرنیں جنہیں بادلوں کی ٹکڑیوں نے بڑی دیر سے ڈھانپ رکھا تھا، موقع پا کر شہداء کو بوسا دینے اتریں تو تابوت پر رکھے شہید میجر صاحب کے چاند ستارے اس انداز سے روشن ہوئے کہ انہوں نے حاضرین کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔شہید صوبیدار کی سرخ پٹی بھی حرارت سے شعلہ بن گئی تھی اور شہید حوالدار کی تین فیتیاں فتح کا نشان بناتے ہوئے یہ گواہی دے رہی تھیں کہ ان شہداء نے نہ صرف اپنی وردی اور ان پر سجے نشانات کی لاج رکھ لی بلکہ قوم نے

انہیں دفاعِ وطن کا جو فرض سونپا تھا، اس میں بھی وہ سرخرو ہوئے۔

نمازِ جنازہ پڑھائی گئی۔ پاک فوج کے ایک چاق چوبند دستے نے شہداء کو سلامی پیش کی اور جسدہائے خاکی ان کے آبائی علاقوں کو روانہ کر دیئے گئے۔

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یاد گار بنا دیا

شہید کے گھر سے بھی روشنیوں کی لہر اٹھ رہی تھی۔ پورا گاؤں عجیب خوشبوؤں سے معطر تھا۔ کیا کبھی کسی نے اس ماں کی کیفیت کا اندازہ لگایا ہے جسے اپنے جواں سال بیٹے کے جسدِ خاکی کا انتظار ہو؟

ماں، جس کے لئے وہ اکثر شال لایا کرتا تھا، آج فخر اور وقار کے پھولوں سے کڑھائی کیا سبز ہلالی پرچم لا رہا ہے جسے اوڑھ کر وہ پھولے نہیں سمائے گی۔ فرطِ جذبات سے اس کے آنسو چھلکنے ہی والے تھے مگر اس خیال سے کہ نجانے اس کا شہید جگر گوشہ کچھ اور ہی قیاس کر لے، آنسو ضبط کے بندھن میں بندھ گئے اور ٹھہر گئے کسی اور وقت چھلکنے کے لئے۔ بہن بھی بے تاب ہے۔ آج اس کا بھائی اپنی بہن کے لئے چوڑیاں نہیں، جرأت و بہادری کے کھن کھن کرتے میڈل لا رہا ہے۔

کسی کی نظر شہید کی ننھی سی معصوم بیٹی پر پڑی جو اپنے جوتے تلاش کر رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی ان جوتوں کو پہن لینا چاہتی تھی۔ اسے یاد ہے کہ جب بھی پاپا آتے، اسے پکار کر کہتے، ''بیٹی! جلدی سے تیار ہو جاؤ، آج ہم گھومیں گے، پھریں گے۔'' جب وہ تیار ہو جاتی تو اکثر اس کے جوتے کھو جاتے اور بابا کو انتظار کرنا پڑتا۔ آج اس نے اپنے جوتے پہلے ہی ڈھونڈ لئے تھے۔ آج وہ اپنے پاپا کو انتظار نہیں کروانا چاہتی تھی۔

یہ تھی اس شہید کی ننھی سی دنیا۔ اگر وہ چاہتا تو اسے اپنی ہی دنیا میں مگن رہنے سے کون روک سکتا تھا۔ مگر وہ قوم کا بیٹا تھا۔ اس نے اپنے فرض کی پکار پر اپنی اس دنیا کو خیر باد کہہ کر بہت سوں کی

ننھی دنیائیں بچالیں۔

زندہ قومیں اپنے شہداء کو کبھی فراموش نہیں کرتیں۔ہر روز انہیں خراجِ تحسین پیش کرنے کا دن ہے۔پوری قوم ان ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو اسی طرح خوش آمدید کہہ رہی ہے جس طرح انہوں نے اپنے شہید بیٹے، بھائی اور باپ کا استقبال محاذ جنگ سے فتح یاب لوٹنے پر کیا تھا۔

قوم ان بہادر ماؤں کو سلام پیش کرتی ہے جنہوں نے اپنے بیٹے اس دھرتی کی حفاظت کے لئے وقف کر دیئے اور ان بیٹوں پر بھی عقیدت کے پھول نچھاور کرتی ہے جنہوں نے اپنا آج ہمارے کل کے لئے قربان کر دیا۔

پاک فوج کو فخر ہے کہ اس کے دامن میں کھلنے والے پھول وطن کی آن بان اور شان پر نچھاور ہونے کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔ایک سولجر جب یونیفارم زیب تن کرتا ہے تو انفرادی خول سے باہر نکل کر اجتماعی سوچ کا حامل ہوجاتا ہے۔ایک گھر کی حفاظت کے بجائے وطن کی حفاظت اس کا مطمح نظر ہوتی ہے۔قوم کے یہ بیٹے دشمن کی سازشوں سے آگاہ ہیں۔انہوں نے قوم کو کبھی مایوس نہیں کیا، نہ کریں گے۔ وہ اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پاکستان کے خلاف ہونے والی اندرونی اور بیرونی سازشوں کے خلاف ڈٹے ہوئے ہیں۔شہداء وطن کا لہو رنگ لائے گا۔ دشمن کی تمام سازشیں خاک ہوجائیں گی۔ دہشت گردی، انتہاپسندی اور فرقہ واریت کے کانٹے ہمیشہ کے لئے صاف ہوجائیں گے۔

*****

یہ کون سخی ہیں

بشریٰ رحمن

.....•••.....

تم کیا جانو کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جن کے قدموں کی دھمک سے پہاڑ تھرتھرا رہے ہیں۔ جن کے ارادوں کے آگے ستارے شرما رہے ہیں۔ جنہوں نے انسانی لباس پہن رکھے ہیں۔ مگر جن کی پیشانیوں پر آسمان تحریریں لکھ رہا ہے۔ یہ کون راہرو ہیں؟ جن کے قدم کبھی تھکتے ہی نہیں۔ یہ فاتح کون ہیں جنہوں نے بھوک اور پیاس کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ جن کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں فرشتے اچکنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ یہ بے داغ پیرہن والے، سنگلاخ ارادوں میں ڈھالے گئے۔۔ عشق کی مٹی سے پالے گئے۔۔۔ راتوں کو جاگتی مطہر ماؤں نے انہیں دودھ پلایا۔ مسجدوں میں جلتے ہوئے چراغوں کی لو پر دعائیں چڑھا کر انہیں مانگا۔ تم کیا جانو۔۔۔ یہ مہنگے لال، یہ انوکھے بیٹے کتنا نرالا کام کرتے ہیں۔ جب ساری خدائی محوِ خواب ہوتی ہے، ان کی بے خواب آنکھیں وطن کی سرحدوں کی حفاظت کرتی ہیں۔۔۔ یہ سدا کے مسافر ہیں۔۔۔ ابدی راہوں کے راہ گیر ہیں۔ یہ رکتے نہیں۔۔۔ دریا ان کی روانی پر رشک کرتے ہیں۔۔۔ یہ تھکتے نہیں۔۔۔ پہاڑ ان کے عزائم کے آگے روئی کے گالے بن کر اڑنے لگتے ہیں۔ پس جب تم ان کو خاکی وردی۔۔۔ سفید وردی یا نیلی وردی پہنا دو گے، یہ اپنی زندگی داؤ پر لگا کر تمہارے محافظ بن جائیں گے۔ کیا تم جانتے ہو دنیا میں کئی قسم کے نشے ہیں۔ کسی کو دولت کا نشہ ہے، کسی کو حسن کا، کسی کو عشق کا، کسی کو ذہانت کا۔۔۔ مگر ان کو وردی کا نشہ ہوتا ہے۔۔۔ وردی پہنتے ہی ان کے اندر ایک الوہی سرشاری آجاتی ہے اور جب یہ آن بان کے ساتھ وطن کی شاہراہوں پر چلتے ہیں تو زمین ان کو دعا دیتی

ہے۔۔۔آسمان جھک کر بلائیں لیتا ہے۔ستارے ان پر نثار ہونے لگتے ہیں۔ساری فصیلیں، ساری شاہ راہیں۔۔۔سارے دریا۔۔۔سارے پہاڑ۔۔۔ان کی وجہ سے اپنی جگہ پر اٹل کھڑے رہتے ہیں۔جب یہ چلتے ہیں تو کائنات ان کے ساتھ چلتی ہے۔بادل اپنی قبائیں چاک کر کے ان پر موتی برساتے ہیں۔۔۔فضائیں خوشبو کی مورچھل ہلاتی ہیں۔۔۔ہوائیں پتوں کے دف بجا کے ان کے راستوں کو صاف کرتی ہیں۔۔۔۔

کبھی تم نے سوچا ہے یہ کون ہیں۔۔۔؟

تمہارے ہی گھروں سے نکل کر یہ آتے ہیں۔تمہارے آنگن میں تمہارے ساتھ مل کر کھیلا کرتے تھے۔تمہارے ساتھ تعلیمی اداروں میں یہ پڑھا کرتے تھے۔تمہاری ماں نے انہیں صدق وصفا کے لباس پہنائے ہیں۔تمہارے اندر سے ڈھل کر یہ نکلے ہیں۔مگر ان کے اسباق کا متن،صداقت،شجاعت اور شہادت سے ترتیب پاتا رہا ہے۔

تم نے ان جیسا جری کوئی دیکھا ہے۔۔۔؟

جب اپنے پیاروں کی دہلیز سے نکل کر آتے ہیں تو مڑ کر نہیں دیکھتے۔۔۔کیونکہ ان کی منزل توافق کے اس پار ہوتی ہے۔جہاں حوریں ہاتھ میں مہکتے ہار لئے ان کی منتظر ہوتی ہیں۔تم نے ان کو پہچانا ہے۔۔۔

سارے خون کے رشتے چھانٹ کر دیکھ لو۔ان کا رشتہ سب سے بڑا ہے۔یہ اپنی سب سے پیاری چیز اپنے وطن پر،اپنے ہم وطنوں پر۔۔۔اپنے قبیلے پر لٹانے کے لئے ہر دم آمادہ نظر آتے ہیں۔ان کو جانو،ان کو پہچانو۔۔۔یہ جو چمکتی۔۔۔دمکتی گلیاں ہیں،جن کے اندر کم نگاہ لوگ گندگی پھیلاتے گزرتے رہتے ہیں۔یہ جو روشن روشن بازار ہیں۔۔۔جو اشیائے زندگی سے اٹے پڑے ہیں اور یہ جو فلک بوس عمارات ہیں۔جن کے اندر عیش ونشاط کے رسیا استراحت فرماتے ہیں۔یہ جو خورد ونوش کے میلے لگے ہیں۔راحتوں کے ٹھیلے لگے ہیں۔جانتے ہو یہ ان کی وجہ سے ہیں۔۔۔یہ پراسرار بندے،یہ وفادار بندے۔۔۔جو تمہیں ہر موڑ پر تو نظر نہیں آتے۔مگر ہر موڑ ان کی نگاہ

میں ہوتا ہے ۔انہوں نے تمہیں زندہ رہنے کی امان دی ہے۔قسم دی ہے اور جان بھی دی ہے! یہ جگمگاتے شہر، یہ خوشحالی کی لہر۔۔۔انہی کے دم سے ہے۔۔۔یہ جاگتے ہیں تو تم سوتے ہو۔۔۔

یہ موسموں کا قہر برداشت کرتے ہیں جب برفباری کے بے مہر موسم میں سن سن کرتی ہوا ہاتھوں کو باندھ دیتی ہے اور جب سخت چٹانوں پر برف کی سفید چادریں بچھ جاتی ہیں ۔ یہ اپنی وردی کا سائبان تان کر چل پڑتے ہیں ۔دشمن کی سرکوبی کرتے ہیں کہ کہیں کوئی بدباطن برف کی آڑ میں چھپ کر سبز جھنڈے کو نہ تاک رہا ہو۔۔۔یہ وہی بچے ہیں ۔جن کی مائیں رات کو انہیں ٹھنڈ سے بچانے کے لئے خود گیلی جگہ پر سوتی تھیں اور انہیں سوکھی جگہ پر سلاتی تھیں ۔ذرا سا زکام ہو جاتا تو ڈاکٹر تلاش کرتی تھیں ۔ ننگے پاؤں ٹھنڈے صحن میں کھیلنے نہیں دیتی تھیں ۔کسی کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے نہ دیتی تھیں ۔ انہیں ماؤں نے یہ بچے وطن کے حوالے کر دیئے۔۔۔دعاؤں کے حوالے کر دیئے ۔بارش، جھکڑ، دھوپ، گرجتے بادل، برف باری، قہر کی گرمی کوئی شے ان کو روک نہیں سکتی ۔ یہ اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں ۔ یہ مادر وطن کے بیٹے ہیں ۔ رہتے زمینوں پر ہیں، نظر آسمان پر رکھتے ہیں ۔ جب مادر وطن پکارتی ہے تو جنم دینے والی ماں کو خدا حافظ کہہ دیتے ہیں ۔اپنے جگر گوشوں کو رخصتی بوسہ دے کر وطن کے نونہالوں کو بچانے کے لئے چل پڑتے ہیں ۔ وطن کی ساری سہاگنوں کے سہاگ بچانے کے لئے اپنی محبوب بیوی کی نظر پڑھے بغیر گھر سے نکل آتے ہیں ۔

ان کے بارے میں بات کرتے ہوئے تم ذرا اپنی زبان کو صاف کر لینا اور اپنے ذہن کے جالے اتار لینا ۔اپنے اپنے گھر کے سجے سجائے پرامن ماحول میں ایئر کنڈیشنڈ، ٹی وی لاؤنج کے اندر مزے دار چٹ پٹے کھانے کھاتے ہوئے، لوڈ شیڈنگ کو کوستے ہوئے، مہنگائی پر لعنت بھیجتے ہوئے، تم اچانک ٹی وی کی سکرین پر جھنڈے میں لپٹا ہوا ایک تابوت دیکھتے ہو۔۔۔جسے بڑے احترام سے خاکی وردی والے ہی اٹھائے ہوئے آتے ہیں ۔۔۔اس کو سامنے رکھ کے سلیوٹ پیش کرتے ہیں ۔پھولوں کا تاج پہناتے ہیں ۔پھر زمین کے سپرد کر دیتے ہیں ۔۔۔پھر نظر اٹھا کر دور

دبلیز پکڑتی اس کی اصلی ماں کا چہرہ دیکھتے ہیں، جس کے چہرے پر بن چاپ کے گرنے والے آنسو ایک تحریر لکھ رہے ہوتے ہیں۔ ''میرے چندا! تم نے میرے دودھ کی لاج رکھ لی۔ مجھے اللہ کے دربار میں سرخرو کر دیا''۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کے ماں کے سینے سے لگ جاتا ہے اور اس کے کان کے قریب منہ کر کے کہتا ہے۔ ''ماں! یہ تابوت تو بس میری وردی لایا ہے۔ میں تو تیرے سامنے بیٹھا ہوں۔ میری آواز سن۔۔۔ میں صبح کی اذان میں ہوں۔۔۔ ہنگامِ سحر چہچہاتی چڑیوں کے نغمے میں ہوں۔ دھوپ میں لہلہاتے کھیتوں اور کھلیانوں میں ہوں۔ شب کے پچھلے پہر دروازوں کو کھٹکھٹاتی ہوا کے اندر ہوں۔۔۔ سورج کی پہلی کرن میں۔۔۔ چاند کے چلتے سفر میں۔۔۔ تیرے نظر نہ آنے والے آنسوؤں میں ہوں۔۔۔ ابا کی پگ کے شملے میں ہوں۔ اپنے ننھے بیٹے کے بستے میں ہوں۔۔۔ اپنی سہاگن کی چوڑیوں کی خاموش کھنک میں ہوں۔۔۔ ماں پہلے میں تیرے گھر میں رہتا تھا۔۔۔ ماں اب میں پورے پاکستان میں ہوں۔۔۔ وطن کے ذرے ذرے کی حفاظت کر رہا ہوں۔۔۔ دیکھ۔۔۔ دیکھ۔۔۔ مجھے۔۔۔ پھولوں میں کھیل رہا ہوں۔۔۔ تاروں میں ہنس رہا ہوں۔۔۔ اس تابوت کو نہ دیکھ۔۔۔ مجھے دیکھ ماں!'' اور پھر تم کیا جانو کہ کون لوگ ہیں یہ، یہ کون سخی ہیں۔۔۔ یہ کون ولی ہیں۔۔۔ دیکھنا جب ان کا ذکر کرو تو زبان صاف کر لینا اور ذہن کے جالے اتار لینا۔

*****

وردی کا ڈی این اے

انوار ایوب راجہ

...... ••• ......

یہ 84-1983 کی بات ہے۔ منگلا ایم پی چیک پوسٹ پر ایک فیٹ گاڑی نے ایک ویگن کا راستہ روکا۔ ویگن میں سے پہاڑی زبان بولنے والے تین بچے اور ایک پرانے طرز کے لباس میں ملبوس خاتون جن کی عمر اس وقت پچیس یا چھبیس سال کے قریب تھی روتی ہوئیں ویگن سے نکلیں اور کار میں سوار ہو گئیں۔ وہ اپنی والدہ کو اسلام آباد ایئر پورٹ چھوڑنے جا رہی تھیں۔ ان کے سب بہن بھائی برطانیہ میں رہتے تھے۔ بس وہ یہاں پاکستان میں اپنے بچوں اور خاوند کے ساتھ رہتی تھیں جو ایک فوجی افسر تھے۔

ان تین بچوں کے لئے کار میں بیٹھنے کا یہ پہلا تجربہ تھا، اس سے پہلے یہ تایا محبوب کی سبز ویگن میں بیٹھ کر اپنی ماں کے ساتھ گاؤں سے میر پور جاتے جو خود میں ایک تفریح تھی۔ منگلا ایم پی چیک پوسٹ سے ان تین بچوں اور ان کی ماں کی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی آئی۔ ایک اور سبز رنگ کی گاڑی میں جس سفر کا آغاز ہوا، وہ آج بھی جاری ہے۔ اس سفر کے دوران بہت سے پڑاؤ ان پانچ مسافروں کی زندگی میں آئے اور اس سفر کا کمال یہ ہے کہ اس کا ہر لمحہ یادگار ہے۔ اس رات وہ کار راولپنڈی صدر میں کپڑوں کی دکان پر رکی۔ ان بچوں اور ان کی ماں کے لئے کپڑے خریدے گئے اور یہ کار آخر کار رات کی تاریکی میں تربیلا پہنچی جہاں ان چار مسافروں کی زندگی کا آغاز ہونا تھا۔

دوسرے روز جب صبح کا آغاز ہوا تو یہ تین بچے اور ان کی والدہ ایک نئے ماحول میں آنکھ کھول رہے تھے۔ بچے اردو کا ایک لفظ نہیں بول سکتے تھے، ان کی ماں پہاڑی زبان کے علاوہ تھوڑی بہت اردو بول سکتی تھیں مگر ان کے لئے ابھی تک یہ تبدیلی ایک بہت بڑا تعجب تھا۔ اس روز یہ بچے جاگے۔ ان کے پاس راولپنڈی سے خریدے ہوئے نئے کپڑے تھے۔ ایک اردلی ایک ٹرے میں کچھ ناشتہ لایا اور ڈائننگ ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ مجھے یاد ہے اس گھر کے باہر ایک تختی لگی تھی جس پر لکھا تھا، کیپٹن محمد ایوب اور یہ وہی صاحب تھے جنہوں نے ایک رات قبل ان تین بچوں اور ان کی والدہ کو کشمیر کے پہاڑوں سے ایس ایس جی کی چھاؤنی میں لاکر محصور کیا تھا۔ یہ کہانی میری ہے، یہ کہانی میری والدہ اور اور میرے بھائیوں کی ہے، مگر اب جب میں زندگی کی چار دہائیاں پوری کرنے والا ہوں، تو مجھے لگتا ہے کہ یہ کہانی میری یا میرے خاندان کی نہیں بلکہ ہر اس خاندان کی ہے جس کا تعلق فوج سے ہے۔ ابو جی اس وقت ایس ایس جی میں تھے اور یہ سبز رنگ کی جیپ کار ہماری پہلی فیملی کار تھی اور یہ ہمارا فوج کی زندگی میں شامل ہونے کا وہ یادگار دن تھا جس کی چھاپ آج تک ہماری زندگیوں پر ہے۔ انگریزی میں کہتے ہیں:

Once a Soldier, Always a Soldier

کچھ ایسا ہی معاملہ ان خاندانوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اس فوج کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں جوان کا بھائی، باپ یا خاوند ہوتا ہے۔ وردی اور سپاہی ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے روح اور جسم۔ یہ رشتہ جو ایک سپاہی کے لئے ریکروٹمنٹ سینٹر سے اور افسر کے لئے کاکول سے شروع ہوتا ہے مگر اس کا اختتام کبھی نہیں ہوتا، یہ رشتہ زندگی ختم ہونے تک ڈی این اے کا حصہ بن کر ساتھ چلتا ہے اور اس رشتے کو ایک فوجی کے ساتھ ساتھ اس کا خاندان بھی اپنا لیتا ہے، جیسے ہم نے اپنایا۔

ان تین بچوں میں سب سے بڑا میں تھا اور دو چھوٹے میرے بھائی تھے۔ ایک اب کینیڈا میں آباد ہے اور دوسرا پاکستان میں ہائی کورٹ کا وکیل ہے اور میں یہاں برطانیہ میں رہتا ہوں جبکہ

ابو جی ریٹائرڈ ہو چکے ہیں اور اب تختی پر کیپٹن نہیں بلکہ لیفٹیننٹ کرنل (ر) لکھا ہوا ہے۔ بہت سا وقت گزر گیا، بہت سی نسلیں جوان ہو گئیں، بہت سی ایس او پیز میں تبدیلیاں کی گئیں، خاکی کی جگہ کیموفلاج نے لے لی، ٹیکنالوجی اور ہتھیاروں کی ساخت اور استعمال میں تبدیلی آئی مگر ان سب کے ساتھ جڑا سپاہی نہیں بدلا، اس کا جذبہ ماند نہیں پڑا، اس کے ڈی این اے کے جرثوموں میں کل بھی سبز لہو موجود تھا اور آج بھی وہی سبز لہو موجود ہے جس میں ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ لہو سرخ ہوتا ہے مگر سپاہی کے لہو میں سبز ہلالی پرچم اپنا رنگ ایسے اتار دیتا ہے کہ اس کی وردی اس کا کفن بن جاتی ہے۔ میں وردی نہیں پہن سکا، شائد میرے مقدر میں یہ نہیں تھا، مگر میں نے اپنی زندگی کا ایک اہم حصہ وردی کے پاس اور وردی کے ساتھ گزارا۔ اس لئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ وردی میرے لئے بھی اتنی اہم ہے جتنی ابو جی کے لئے تھی۔ ایس ایس جی کچھ دیوانوں کا ایک ایسا گروپ ہے جو کسی نام، ایوارڈ اور میڈل کے لئے اس کا حصہ نہیں بنتے بلکہ وہ ایک مختلف سوچ ہے، ایک الگ مائنڈ سیٹ، ایک مکمل اور دیوانہ وار عشق یعنی من جانباز م۔ ہم جب فوج کی زندگی کا حصہ بنے تو ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ ہماری زندگی میں سب سے پہلے فوج اعتماد کا ٹیکہ لگائے گی ہمیں وہ پاکستان کا ہر علاقہ دکھائے گی، ہمیں ایران سے افغانستان اور انڈیا سے چین کی سرحدیں دکھائے گی۔ ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ ہمارے پڑوس میں بریگیڈیئر ٹی ایم جیسے جنگجو ہوں گے، ہمیں ہر گز یہ پتہ نہیں تھا کہ شاہراہ دستور پر اللہ ہو کا نعرہ بلند کرتے ہوئے جب ہمارے والد اپنے ساتھیوں کے ساتھ 23 مارچ کی پریڈ میں شامل ہوں گے تو جذبے اور جوش سے ہمارے آنسو نکلا کریں گے۔ ہمیں نہ کسی ایف جی سکول کا علم تھا اور نہ ہی کبھی آرمی پبلک سکول کا سوچا تھا، یہ کبھی بھی ہمارے گمان میں نہیں تھا کہ ہم تیراکی سیکھیں گے یا ہمیں کبھی دنیا کے بلند ترین محاذ جنگ پر ہیلی کاپٹر سے لٹک کر جانے والے کیپٹن نوید اور ہوا بازی کی عالمی تاریخ کے عظیم ہیرو ایم ایم عالم سے ملنے کا موقع ملے گا اور پھر یہ کس نے سوچا تھا کہ کارگل کی جنگ میں شہداء کی فہرست میں ایک نام کیپٹن جاوید اقبال کا ہوگا جو میری والدہ کے بھائی ہوں گے اور کسے معلوم تھا کہ اسی فوج میں

ہمارے ہم عصر بھی وہی وردی پہنیں گے جوان کے بھی ڈی این اے کا حصہ تھی، کسے علم تھا کہ ان میں سے کچھ ہم سب کو پیچھے چھوڑ جائیں گئے اور سبز ہلالی پرچم کا انتخاب اپنے کفن کے طور پر کریں گے۔ بس یہ فوج کا کمال ہے اور فوج کی زندگی کا ایک ایسا پہلو ہے جس پر کوئی لکھتا نہیں اور شائد کوئی بولتا بھی نہیں مگر میں آج ایسا کیوں سوچ رہا ہوں؟ میں تو مکمل سویلین ہوں۔

بس یوں ہی کبھی کبھار غیر ارادی طور پر جب پاکستان جاتا ہوں تو ان گلیوں میں چلتا ہوں جہاں بچپن گزرا اور جہاں آج بھی تندرست جسموں اور بلند جذبوں والے سپاہی رہتے ہیں، بس ایک رشتہ ہے جو خود ہی قائم ہے، بس وہ پرانے دوست جو کبھی اسکول میں ساتھ پڑھتے تھے۔ اب کرنیل بن گئے ہیں اور ان کو مل کر کچھ یادیں تازہ ہو جاتی ہیں مگر پھر بھی میں یہ سب کیوں لکھ رہا ہوں؟

محمد میرا بیٹا ہے جو ماشا اللہ تین سال کا ہونے والا ہے اور اب وہ باتیں بھی کرتا ہے، محمد اپنی پیدائش کے بعد سے اب تک تین بار پاکستان جا چکا ہے۔ وہ ایک برٹش پاکستانی/کشمیری بچہ ہے۔ اس کا تعلق اس مٹی سے ہے جس میں وہ پیدا ہوا مگر اسے میں نے اور میری بیگم نے ہمیشہ وہ چار دیواری دکھائی ہے جس سے ہمارا تعلق ہے۔ محمد کو اس کی ماں نے بہت محنت سے اپنی زبان کے کچھ لفظ سکھائے جیسے ''ابو جی''، ''پاکستان زندہ باد''، ''دل دل پاکستان'' اور ''اللہ جی کرم کرو''۔ میری سٹڈی میں ابو جی کی ایک تصویر لگی ہے جسے وہ دیکھتا ہے اور اس تصویر سے باتیں کرتا ہے، مجھے اس کی باتوں کی سمجھ نہیں آتی مگر وہ اپنی ماں کو سب کچھ سمجھا لیتا ہے، شائد ایسا ہم سب نے کیا ہو۔ آج ہم گاڑی میں کہیں جا رہے تھے، محمد متواتر کچھ کہہ رہا تھا اور میری بیگم فرنٹ سیٹ پر بیٹھی رو رہی تھی، میں نے پوچھا تو وہ بولی کہ محمد نے ٹی وی پر ایک نغمہ سنا ہے اور کل سے بے دھیانی میں گنگنا رہا ہے۔ میں نے بیگم سے رونے کی وجہ پوچھی تو وہ بولی کہ محمد کہہ رہا ہے، ''مجھے دشمن کے بچوں کو پڑھانا ہے۔'' یہ سنتے ہی میری آنکھیں بھی تر ہو گئیں مگر نہ جانے کیوں منہ سے شکر کا کلمہ ادا ہوا، مجھے اتنے سالوں بعد یہ احساس ہوا کہ وردی ابھی بھی ہمارے ڈی این اے کا حصہ ہے۔

*****

سپاہیوں کا سپاہی

لیفٹیننٹ کرنل ذیشان فیصل خان

.....◆◆◆.....

موبائل فون کی گھنٹی مجھے اپنے خواب میں بجتی ہوئی محسوس ہوئی، ہڑبڑا کر اٹھا، میں شائد صوفے پر بیٹھے بیٹھے سوگیا تھا۔موبائل اب بھی بج رہا تھا۔کرنل ناصر کا نام ڈسپلے پر آرہا تھا۔رات کے تین بج رہے تھے۔میں نے کال لی تو ناصر نے کہا کہ سر جنرل آپ سے بات کریں گے۔ اگلے ہی لمحے جنرل ثناء کی ہشاش بشاش آواز سنائی دی۔''ہاں بھئی سوگیا تھا؟''میں کچھ ہاں ناں کرتا سارہ گیا۔جنرل نے ایک میڈیا کے چینل پر چلتی پٹی کی طرف میری توجہ مبذول کروائی۔''یہ ٹھیک نہیں ہے۔''انہوں نے مجھے چینل کو صحیح اطلاع دینے کی ہدایت دی اور فون بند ہوگیا۔میں نے فوراً دی ہوئی ہدایت پر عمل کیا اور اصلاح کروائی۔جنرل ثنا کے زیرِ کمان میری ان بہت سی راتوں میں یہ ایک اور رات تھی جب دہشت گردی کے خلاف کارروائی میں جنرل خود اپنی کمان پوسٹ میں بیٹھ کر ساری رات تمام کارروائی کا جائزہ لے رہے ہوتے تھے،خود احکامات دیتے اور زیرِ کمان صیغوں کی راہنمائی کرتے۔میجر جنرل ثناءاللہ خان بحیثیت مالاکنڈ ڈویژن کمانڈر 15 ستمبر 2013 کو بن شاہی (اپر دیر) کے مقام پر اگلے مورچوں کا دورہ کرتے ہوئے دہشت گردوں کی لگائی ہوئی IED کے پھٹنے سے شہید ہوگئے اور ان کے ساتھ یونٹ کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل توصیف اور لانس نائیک عرفان ستار بھی شہادت کے عظیم رتبے پر فائز ہوئے۔

فوج میں کہا جاتا ہے کہ جنرل آفیسر میں کوئی نہ کوئی خوبی ایسی ہوتی ہے جو سب سے نمایاں

اور منفرد ہوتی ہے۔ جنرل ثناء کی خوبی ان کا پیشہ ور سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی انسان دوست ہونا تھا۔ ان کے کہے ہوئے پہلے جملے سے ہی ماحول کو ٹھہراؤ آ جاتا۔ سوات میں ان کے دور میں مختلف چیلنجز آئے لیکن انہیں ہمیشہ پرسکون اور پر وقار پایا۔ ایک انتہائی نڈر سپاہی جو درپیش خطرات سے خوش اسلوبی سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا۔ جو زیرِ کمان کی خطا کو درگزر کرنے والا اور بلا کا اہلِ فہم۔

شہادت سے ایک دن پہلے جن جوانوں کے ساتھ انہوں نے رات گزاری، وہ پوسٹ دہشت گردوں کی کمین گاہ کے بہت قریب تھی اور کسی بھی وقت دہشت گردی کی کارروائی ہوسکتی تھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جنرل ثناء کی اتنی قدآور شخصیت کو عام زندگی نہیں جینا تھا، وہ ابدی حیات کے متلاشی تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انگلینڈ میں فوجی قبرستان میں ایک ضعیف شخص قبروں کے قریب بیٹھا زاروقطار رو رہا تھا۔ کسی کو فکر ہوئی تو پوچھا کہ آپ کیوں اتنا رو رہے ہیں تو اس نے جواب دیا کہ میں جنگ عظیم دوم کا فوجی ہوں اور یہ میرے ساتھیوں کی قبریں ہیں جو اس جنگ کے دوران ملک کی خاطر قربان ہوئے۔ مرنا تو میں نے بھی ہے لیکن سوچتا ہوں کہ ان کے ساتھ مر جاتا تو کیسی عظیم موت تھی۔

بحیثیت افسر تعلقات عامہ میں نے جنرل کے بہت قریب رہ کر کام کیا۔ جنرل ہر مسئلے کے بارے میں بڑی توجہ سے سنتے اور پھر اپنا فیصلہ دیتے۔ کئی موقعوں پر دلائل سن کر اپنے دیئے ہوئے حکم کو موقعے کی مناسبت سے ڈھالتے اور اس میں کبھی بھی ناراضگی یا ناگواری کا شائبہ تک نہ ہوتا۔ مختلف دوروں میں فوجی جوانوں کے ساتھ ایسے ملتے کہ فوجیوں کی تھکان دور ہوجاتی۔ شہادت سے ایک رات پہلے جس پوسٹ پر رات کو ٹھہرے وہاں پر اپنے لئے ناشتے کی فرمائش میں کہا کہ مجھے رات کی روٹی اور سالن دے دو۔

ان کے سٹاف آفیسر میجر سلیم کے پاس ہر وقت فوجی جوانوں کے مسائل کی ایک لسٹ نوٹ ہوتی جس میں زیادہ تر جوانوں کے گھریلو مسائل ہوتے اور جنرل انہیں حل کرنے میں کوشاں

رہتے۔میرے ذاتی معاملات میں بھی جنرل ثنا نے دلچسپی لے کر میری مدد کی اور جب بھی ان کا شکریہ ادا کرنا چاہا انہوں نے بے نیازی سے کہا ''اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو'' ظرف اور کشادہ دلی اتنی کہ دوسرے کے لئے سمیٹنا مشکل ہوجائے۔جنرل کے پاس ایک رپورٹ آئی کہ کوئی شخص فوج کے رفاہ عامہ کے کئے ہوئے کاموں کا سہرا اپنے سر لے رہا ہے اور اس کے عوض وہ مختلف جگہوں سے فنڈ بھی اکٹھا کر رہا ہے۔جنرل کا سوال تھا کہ کیا اس نے سوات کے حوالے سے کوئی خدمت کی ہے؟۔جواب ملا کہ کی تو ہے لیکن محدود۔جنرل نے کہا کہ اگر اس طرح سوات کو کچھ اور فائدہ ہوجاتا ہے تو مجھ پر اس کا کوئی فرق نہیں پڑتا۔جنرل نے ایک دورے کے دوران پگوڑے گاؤں (ڈسٹرکٹ شانگلہ) میں مقامی لوگوں کی درخواست پر ایک گرلز سکول کھولنے کا وعدہ کیا۔سکول کا تخمینا تنازیادہ تھا کہ کوئی بھی اس کو فنڈ کرنے کو نہیں مل رہا تھا۔اس کی وجہ سکول کے تعمیر کے مقام کا انتہائی دُورافتادہ ہونا تھا۔جنرل نے اپنے وعدے کو پورا کرنے کے لئے اپنے ذاتی پیسے مختص کئے۔اس کے علاوہ اپنے تمام دوستوں اور رشتہ داروں سے بھی انہوں نے اس کے لئے مالی مدد لی۔جنرل ثناء ہر نئے آئیڈیا کو سنتے اور اس کی تکمیل میں ہر قسم کی ضروریات کو پورا کرنے کی ہدایت دیتے۔

جنرل کی جدائی کی خبر پر ہر دل دکھا لیکن اس احساس سے کہ جو رتبہ انہیں ملا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا سے ممکن ہے۔جنرل کی فیملی کے لئے یقینا یہ ایک کٹھن لمحہ ہے ان کی بیگم اور بیٹیاں ایک عظیم انسان کی ظاہری موجودگی سے تو ضرور محروم ہوئی ہیں لیکن ان کے لئے یہ باعث تقویت ہے کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کے تمام گھر والوں کو استقامت اور بلند حوصلہ دے۔آمین

*****

تابندہ تر ہے تم سے جہانِ وطن کا نام

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

...... ♦♦♦ ......

شہید میجر جنرل ثنااللہ خان نیازی میرے ضلع میانوالی کا فخر تھے۔ یہ وہ اعلیٰ لوگ ہیں جو جان دے کر قوم کو زندہ کرتے ہیں۔ ہماری فوج دنیا کی بہترین افواج میں سے ایک ہے اور اس کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ شہید ہونے کی خواہش میں افسروں اور جوانوں میں فرق نہیں ہے۔

وہ سالاری کیا ہے جو اپنے سپاہیوں کے ساتھ مرنا جینا سانجھا نہ کرے۔ شہید جنرل نیازی نے اپنے جوانوں کے ساتھ اگلے مورچوں میں رات گزاری۔ یہ آخری رات زندہ رات بن گئی۔ رات کا ایک راز ہوتا ہے اور وہ صرف جاگنے والے بہادروں کو ملتا ہے۔ مجھے شہید ڈی ایس پی اکرام اللہ خان نیازی یاد آتے ہیں۔ لاہور میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ڈاکوؤں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ زخمی ڈی ایس پی نیازی کے لئے میو ہسپتال میں لوگوں کا ہجوم ایک دوسرے سے لپٹ کر روتا تھا، ایسا پولیس افسر کم کم دیکھا گیا ہے۔ خلاص خان بھی پولیس افسر تھے، داؤد خیل کے رہنے والے تھے۔ شہید جنرل ثنااللہ خان نیازی ان کے بیٹے تھے۔ ان کے دوسرے بیٹے رحمت اللہ خان نیازی ڈی آئی جی کوئٹہ رہے ہیں۔ کوئٹہ میں ڈی آئی جی فیاض سنبل بھی دہشت گردی میں شہید ہوئے تھے۔ سنبل میانوالی کے نیازی ہیں۔ بہت اچھے دماغ والے بیورو

کریٹ عبداللہ سنبل نے ان کے لئے تفصیل سے بتایا۔ میانوالی نے پاکستان کے لئے ہمیشہ شاندار قربانیاں دی ہیں۔ وارث نیازی کے ساتھ تفصیل سے بات ہوئی وہ میانوالی کے لئے سوچتا ہے اور اپنی زندگی اپنے علاقے کے لئے وقف کئے ہوئے ہے۔ چہلم کی وجہ سے شہید جنرل کے لئے ان کے رشتہ داروں سے رابطے میں اسے مشکل پیش آئی۔ شہید جنرل کے بھائی امین اللہ خان نے بتایا کہ میانوالی کی تاریخ میں شہید کا جنازہ بے مثال تھا، میانوالی کے بہادر لوگ اپنے نامور اور عظیم بیٹوں کی قدر کرتے ہیں۔ وارث نیازی نے میانوالی کے لوگوں کی طبی معاونت کے لئے ایک تنظیم بیٹر لائف (بہتر زندگی) بنائی ہے۔ وہ بہت محنت کرنے والا جوان ہے۔ اس کی ملاقات شہید جنرل ثناءاللہ نیازی سے بھی ہوئی تھی۔ وہ پاکستان کے لئے بالعموم اور میانوالی کے لئے بالخصوص ایک اچھی زندگی کا خواب دیکھتے تھے۔ شہید میجر جنرل نیازی سوات میں ڈویژن کے جی او سی تھے، کھاریاں میں بھی ان کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں اور جوانوں میں ایک ہر دلعزیز بہادر جرنیل کے طور پر پسند کئے جاتے تھے۔ وہ پاکستان کے لئے قابلِ فخر تھے، میانوالی کی شان تھے۔ جنرل حمید گل ان کے لئے ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ بہت بڑی بڑی باتیں کر رہے تھے۔ راولپنڈی میں ان کے جنازے میں جنرل کیانی بھی شریک ہوئے۔ جنرل کیانی نے تدبر اور تحمل کے ساتھ ایک معتدل بیان دیا ہے کہ ہم میں چیلنج سے مقابلہ کرنے کی پوری اہلیت ہے مگر ہم امن کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے دل دکھ سے بھرے ہوئے ہیں مگر کسی کو سیاسی ماحول خراب کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

سوات میں مالم جبہ کے مقام پر ایک فیسٹیول کا اہتمام بھی شہید جنرل ثناءاللہ خان نیازی نے کیا تھا۔ وہ سوات کی معرکہ آرائی میں آگے آگے تھے۔ کالام روڈ بحال کرانے والوں میں شہید جنرل نیازی شامل تھے۔ وہاں سے مولوی فضل اللہ کو بھاگنے پر مجبور کیا گیا۔ وہ افغانستان میں نہ صرف پناہ گزیں ہوا بلکہ مورچہ نشین بھی ہوگیا۔

میجر جنرل ثناءاللہ کی شہادت کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے کہ بارودی سرنگ پھٹ گئی۔ جنرل کی

نقل وحرکت خفیہ رکھی جاتی ہے تو پھر جاسوسی کون کر رہا تھا۔ دہشت گرد کسی ہائی ویلیو ٹارگٹ کے تعاقب میں تھے۔ پاکستان دشمن طاقتیں چاہتی ہیں کہ میدانِ جنگ پاکستان ہو۔ کامرہ ایئر بیس کراچی نیول بیس اور جنرل کی شہادت مقامی لوگوں کا کام نہیں ہے۔ پاک فوج پاکستان کے لئے کتنی اہم ہے اس حقیقت کا اندازہ ہماری قوم کو ہونا چاہئے۔

*****

سعادت کی زندگی شہادت کی موت

نغمہ اشرف

...... ♦♦♦ ......

مئی آ کر گزر چکا ہے۔ مگر مئی کا ستارہ نہیں آیا۔ کون ۔۔۔؟ وہی ستارہ جس نے 3 مئی 1988 کو جنم لیا اور بدر کامل بن کر 31 مئی 2013 کو جام شہادت نوش کر گیا۔ ان ماں باپ کو خوش نصیب کہوں یا حرماں نصیب جن کا شیر جوان وطن کی سلامتی اور دین کی سربلندی کے لئے عین جوانی میں قربان ہو گیا۔ یقیناً وہ انتہائی خوش قسمت ہیں جن کے لال نے شہادت کا رتبہ پا کر نہ صرف خود حیات جاوداں پائی بلکہ ان کے لئے بھی فلاح دارین کا باعث ثابت ہوا۔ اس نے محض 25 برس کی عمر میں وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جو لوگ برس ہا برس جی کر بھی نہیں کر پاتے۔

مقامِ شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

کیپٹن حسن جاوید شہید میرا وہ پیارا بھانجا تھا جو اپنے والدین کی دوسری اور واحد اولاد نرینہ تھی۔ اس سے پہلے منصور جاوید محض چھ ماہ اور چھ دن کی مختصر حیات لے کر آیا تھا۔ وہ ننھی کلی بھی پل کے پل مرجھا گئی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک سال کے اندر ہی حسن کی صورت اسے دوبارہ اس دنیائے فانی میں بھیج دیا تو ماں باپ کے آنسو خشک ہو گئے اور وہ ننھیال اور ددھیال کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ سرخ و سفید رنگت، بھولی صورت، کم گو، حساس، قدرے شرمیلا مگر انتہائی پھرتیلا اور جرأت مند۔ نیز احساس ذمہ داری اس کی ایسی صفات تھیں جو اسے ہر دلعزیز بنانے کے لئے کافی تھیں۔ خون کے رشتوں سے ہٹ کر وہ دوستوں، رشتہ داروں، محلے داروں اور آخر میں اپنے ماتحتوں میں

بھی بے حد چاہا اور سراہا جاتا تھا۔ نچلا بیٹھنا تو گویا اس نے سیکھا ہی نہ تھا لیکن کسی کو نقصان پہنچانا، زبان درازی، فضول بحث وتکرار یا کسی کا مذاق اڑانا اس کا شیوہ نہ تھا۔ اکلوتا بیٹا ہونے کے باوجود والدین کی طرف سے کبھی بے جالاڈ پیار یا خصوصی رعایت کا مستحق نہیں ٹھہرا جبکہ دونوں بہنیں چھوٹی ہونے کا ناجائز فائدہ بھی اٹھا لیتیں۔ درحقیقت جاوید بھائی اسے ایک مضبوط، مکمل اور کامیاب انسان بنانا چاہتے تھے۔ جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہوئے۔ حسن اپنی ذہانت، جرأت اور سعادت مندی کے باعث ہمیشہ ہم سب کی امیدوں پر پورا اترا۔ میدان خواہ تعلیم کا ہو یا کھیل کا، اسے مات دینا آسان نہ تھا۔ ایف ایس سی میں شاندار کامیابی اور انجینئرنگ کالج میں داخلے کے باوجود پاک آرمی میں شمولیت کا شوق اس پر حاوی تھا۔ لہٰذا جب اس طرف گیا تو بلا رکاوٹ ہر ٹیسٹ پاس کرتا ہوا پاکستان ملٹری اکیڈمی جا پہنچا۔ اکیڈمی کی سخت فوجی تربیت اس کی خطر پسند طبیعت کے لئے گویا کھیل تھی۔ کچھ کر گزرنے کی خواہش بلوچ رجمنٹ میں اس کی شمولیت کا باعث بنی۔ ساڑھے پانچ سالہ فوجی نوکری کے دوران وہ اپنے حلف کی پاسداری کرتے ہوئے کبھی سوڈان میں اقوام متحدہ امن مشن کا حصہ بن کر دہشت گردوں اور شدید ملیریا سے جنگ لڑتا رہا تو کبھی سندھ میں سیلاب زدگان کی خدمت میں دن رات مصروف کار رہا۔ کبھی کوئٹہ میں Survival Course میں کامیابی سے ہمکنار ہوا تو کبھی چھور کی فوجی مشقیں جیت کر نام کمایا۔ شکست کا تصور اس کی زندگی سے دور تھا۔ اس کے شاندار عسکری ریکارڈ کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے کورس کے لئے مصر بھی بھجوایا گیا۔ پچھلے پونے دو سال سے وہ سوات، کرم ایجنسی، ہنگو، خیبر ایجنسی اور بالآخر وادی تیراہ میں دہشت گردوں سے نبرد آزما تھا جہاں اس نے چھوٹے بڑے 30 سے زائد آپریشنز میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ اپنی جان کی بازی لگا کر دہشت گردوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی شمولیت کو آپریشن کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ 30 اپریل 2013 کو جب وہ زندگی کی آخری چھٹی گزار کر واپس جا رہا تھا تو اس کی چھٹی حس اسے شہادت کی خوشخبری دے رہی تھی جس کا اظہار اس نے اپنے دوستوں سے

بھی کیا اور آخری رات جاوید بھائی نے اسے زیر لب کہتے سنا۔ کسی کی شہادت کی خبر ٹی وی پر چل جائے گی۔ اپنے پیاروں سے بچھڑنے کا دکھ لئے وہ معصوم موت کی وادی کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد ہم صبح وشام حسب معمول اس کی اور پاک فوج کی کامیابی اور سلامتی کی دعائیں مانگتے رہے۔ زندگی کا یہ آخری ماہ اس نے کس صبر و برداشت میں گزارا ہوگا، یہ وہی جان سکتا ہے جسے شہادت کا اشارہ مل چکا ہو۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس نے فون پر بھی کبھی حوصلہ نہ ہارا، حتیٰ کہ آخری آپریشن پر روانگی سے قبل ماں اور بہن سے ہونے والی ٹیلیفونک گفتگو میں بھی محض اسی کامیابی کے لئے دعا کرنے کے لئے کہا اور پرس میں رکھے گئے بہن کے نام خط کے بارے میں بتایا۔ اس خط کو پڑھ کر صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی منزل دیکھ چکا تھا۔ وہی منزل جو ہر مجاہد کی تمنا ہوا کرتی ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

30 اور 31 مئی 2013 کی درمیانی شب پانچ چھ گھنٹے اسلحہ اور بھاری بوجھ کے ساتھ سنگلاخ چٹانوں کو عبور کرتے ہوئے وہ اپنے ٹارگٹ پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اپنے لیفٹیننٹ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے پیش قدمی جاری رکھی۔ کیونکہ اس کی اصلی منزل اسے پکار رہی تھی۔ دیگر دو کمپنیاں دہشت گردوں کی لگاتار فائرنگ کی زد میں تھیں۔ حسن شہید انہیں کور دینے کے لئے آگے بڑھا اور فائرنگ کا رخ اپنی جانب مبذول کروایا تاکہ دونوں کمپنیوں کو سنبھالا مل سکے۔ تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ ''جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا'' کی حکمت عملی اپنائے وہ دہشت گردوں سے لڑتا رہا۔ وہ اپنے کسی بھی جوان کی شہادت کے لئے خود کو اللہ کے سامنے جوابدہ سمجھتا تھا اسی لئے اپنے ساتھ آئے جوانوں کو حفاظت و کامیابی سے لڑاتا رہا۔ وہ خود خطرہ مول لے کر دشمن کو کاری ضرب لگانے اور شدید جانی نقصان پہنچانے میں پیش پیش تھا۔ یہاں تک کہ سامنے سے آنے والی ایک گولی میرے شہزادے کے گلابی چہرے کو گلنار کرتے ہوئے سر کی پچھلی جانب سے نکل گئی اور رات بھر

کے پیاسے حسن نے موقع پر ہی جام شہادت نوش کرلیااور آپریشن کا پہلا شہید بن کر کامیابی کی ضمانت دے دی۔آہ! وادی تیراہ! تو نے ہماری دنیا تیرہ وتاریک بنا دی۔ہمارے گھر کا وہ روشن چراغ گل کردیا جو اپنے ساتھ ہماری ساری خوشیاں بھی لے گیا۔ہم جس کے لئے زندگی اور کامیابی کی دعائیں مانگتے تھے اللہ تعالیٰ نے اسے دونوں سے نوازدیا یعنی

''سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت''

کیپٹن حسن نے شہید ہوکر حیات جاوداں اور بلندی ء درجات پائی ہے۔ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم خاکی انسان شہید کے درجات کی بلندی کا شعور نہیں رکھتے اسی لئے اس کے وجود کی جدائی میں تڑپتے ہیں۔حکومت نے اس کی جرأت و بہادری کا اعتراف کرتے ہوئے اسے ستارہ بسالت سے نوازا ہے۔

*****

وہ جس کے بنا گھر ہوا سُونا سُونا

امِ شرجیل

......•••......

میری بھی لفاظی ختم ہوگئی ہے۔ بہت کچھ لکھنا چاہتی ہوں مگر الفاظ کھو جاتے ہیں، گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔لوگ کہتے تھے کہ وقت کے ساتھ زخم بھر جاتے ہیں۔ وقت مرہم لگا دیتا ہے مگر مجھے ایسے ہی لگتا ہے کہ زخم پہلے دن سے بھی تازہ ہیں۔شہادت کا فخر اپنی جگہ مگر جدائی کا زخم سہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔یہ بات صرف شہداء کی فیملیز ہی جانتی ہوں گی۔ہم سب کا دکھ درد ایک جیسا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں ہمارے تمام شہداء پر اور اللہ میرے ملک کی حفاظت فرمائے۔شہداء کا خون رائیگاں نہ جائے۔شہداء کے جنازے بہت بڑے بڑے اور پورے اعزاز کے ساتھ ہوتے ہیں۔میرے پیارے بیٹے کے جنازے میں ہر طبقہ فکر کے لوگوں نے شرکت کی۔ میں نے پہلی دفعہ اتنا بڑا جنازہ دیکھا تھا۔اب نہ کوئی خوشی،خوشی لگتی ہے اور نہ ہی غم،غم لگتا ہے۔ میں زندگی کا ایک دن کم ہونے پر روز سوچتی ہوں کہ ایک دن اور کم ہوگیا۔اب اپنے بیٹے سے ملنے کے نزدیک ہو رہی ہوں۔

ستمبر 2014 کیا شروع ہوا کہ نئے سرے سے یادوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ویسے یہ مہینہ سب پاکستانی کیسے بھول سکتے ہیں۔اسی ماہ میں ڈیفنس ڈے منایا جاتا ہے۔میرے پیارے بیٹے کا جوش وخروش بھی ستمبر میں بڑھ جاتا تھا، جس کا وہ اظہار بھی کیا کرتا تھا۔اسی طرح اس نے

ستمبر 2012 میں ہی فیس بک پر پروفائل فوٹو چینج کی اور ایک شہید کا جنازہ تھا، وہ فوٹو لگائی۔ شرجیل شہید کے ایک دوست نے Comment کیا کہ جب تم شہید ہو گے تو یہ شہید کے جنازہ والی فوٹو کام آئے گی اور پھر ایسے ہی ہوا، میرا لختِ جگر، شہزادوں جیسی آن بان رکھنے والا 20 ستمبر 2012 کو بروز جمعرات شہید ہوگیا اور بڑی شان سے جمعۃ المبارک کو آرمی قبرستان میں نمازِ جنازہ کے بعد ہمیشہ کے لئے ہماری آنکھوں سے تو اوجھل ہوگیا مگر دلوں میں اسی طرح آباد ہے جیسے ایک شہید کو ہونا چاہئے۔ میرا بیٹا جمعہ کے دن ہی پیدا ہوا اور جمعہ کے دن ہی اس دنیا سے چلا گیا۔ شرجیل سے آخری دفعہ بات بدھ کے دن ہوئی۔ ویسے تقریباً 3 منٹ کی کال ہوتی تھی۔ اس دن کوئی 15 یا 16 منٹ بات ہوئی۔ آپریٹر بار بار فون چیک کرتا، پھر کچھ کہے بغیر فون رکھ دیتا۔ آخری باتیں بھی میرے بیٹے کی اپنی چھوٹی بہن کو نصیحت ہی تھی، ''عمارہ تمہارا فائنل ایئر ہے، خوب پڑھنا۔ نانو (نانی اماں) کا BP کا چارٹ بنانا'' وغیرہ وغیرہ۔ مجھے کسی نے بتایا کہ شرجیل کہتا تھا کہ میرے نام کے ساتھ تین ''S'' ہیں، ایک S اور آئے گا۔ یعنی شرجیل شاہد شنواری (شہید)۔ میرا بیٹا میرے لئے بڑی ہی خوبصوت یادیں چھوڑ گیا۔ اپنی بہت خوبصورت نشانیاں چھوڑ کر گیا ہے۔ میرے ڈرائنگ روم کے ایک کارنر میں میرے بیٹے کی سکول کی شیلڈز پڑی ہیں۔ فرسٹ پرائز کپ پڑے ہیں۔ میرا بیٹا اپنے ہاتھوں سے خوبصورت خطاطی کرتا تھا۔ ایک خطاطی یا رحیم کی ہے جو اس نے بلیک اینڈ وائٹ کی ہے جس پر اس کو پہلا انعام دیا گیا۔ میرے بیٹے کی خطاطی آج بھی آرمی میڈیکل کالج کے ایک ہال میں دیوار پر آویزاں ہے۔ اس کے علاوہ پہلا کلمہ، بسم اللہ الرحمن الرحیم اور اسماء الحسنیٰ کی خوبصورت خطاطی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام لکھتے وقت اس نے کہا کہ ممی آپ ویسٹریج سے مجھے خوبصورت چوڑیاں لا دیں۔ پھر میرے سامنے ایک ایک نام کو اس ایک چوڑی میں فکس کیا۔ شاہد صاحب (میجر ریٹائرڈ شاہد شنواری والد کیپٹن شرجیل شہید) نے فریم کروائے۔ یہ میرے ڈرائنگ روم کی دیواروں پر چاروں طرف خوبصورتی سے سجی ہیں۔ اللہ تعالیٰ میرے بیٹے کو ان پر بھی اجر عطا فرمائے (آمین) اور اس کے

لئے صدقہ جاریہ بنے۔

یہ تمام خطاطی وہ اپنے کالج کی ایک نمائش میں رکھنے کے لئے بناتا تھا۔ ویسے میری بیٹی شمیلہ بھی خطاطی کرتی ہے مگر پہلا انعام شرجیل کو ہی ملا۔شرجیل ایک نرم دل اور حساس طبیعت کا مالک تھا۔رمضان کے پہلے عشرے میں میں،شاہد اور میری بیٹی شمیلہ،شرجیل کو کوہاٹ چھوڑ کر اللہ کے حوالے کر کے آئے۔کچھ دنوں کے بعد کانوائے جب وزیرستان کے لئے روانہ ہوا تو گرمی کی شدت کی وجہ سے کچھ لوگوں (جوانوں) کی طبیعت خراب ہوئی۔خاص کر جن کا روزہ تھا۔شرجیل نے پوچھا تو میں نے بتایا کہ بیٹا جوانوں سے کہو کہ تم حالتِ سفر میں ہو اور دوسرا جہاد پر جارہے ہو، اگر کوئی روزہ چھوٹ گیا تو بعد میں قضا کر لینا۔رمضان میں ہی لیفٹیننٹ عثمان وانا میں زخمی ہوا تو جب ہیلی کاپٹر پر پشاور سی ایم ایچ لا رہے تھے تو شمیلہ کو کہا کہ ممی سے کہنا دعا کریں۔میں نے کہا کہ دعا میں ضرور کروں گی مگر مجھے نہ بتانا کہ کیا ہوا۔عثمان تو ماشاءاللہ ٹھیک ہوگیا،اس کے لئے دعا کروانے والا شہید ہوگیا۔اس دن ہی شرجیل واپس وانا گیا تو روزہ ہیلی کاپٹر میں ہی افطار کیا۔ کہنے لگا کہ بڑا ہی مزہ آیا۔اسی طرح ایک کیپٹن (شرجیل کا فیس بک کافرینڈ تھا) وہ شہید ہوا تو مجھے لیپ ٹاپ میں اسکی تصویر دکھائی۔کہنے لگا، یہ شہید ہوگیا ہے۔میں نے کہا، بچے میں ایک کمزور اور نرم دل کی مالک عورت ہوں۔مجھے نہ دکھایا کرو۔پھر کوئی بات ہوتی تو شمیلہ کو بتاتا کہ ممی کو نہیں بتانا۔شاید وہ یہ باتیں کر کے، یہ تصویریں دکھا کر ماں کا دل مضبوط کرنا چاہتا تھا یا ان کے لئے دعا کروانا چاہتا تھا اور مجھے بھی میرے اللہ نے دعاؤں پر لگا دیا۔یہ سب کچھ میرے رب کی طرف سے تھا۔مجھے نارمل سی کوکنگ آتی تھی مگر میرا بیٹا اچھے کھانے کھانے کا بہت شوقین تھا۔میں کھانا بناتی تو کہتا کہ میری ممی جیسی کوکنگ کسی کی نہیں۔مجھے تو لگتا ہے میرے پاس صرف ایک ہفتہ رہا ہے۔(ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک) پہلی دفعہ بھی پشاور سی ایم ایچ میں جب میری گود میں آیا تو سویا ہوا تھا اور آخری دفعہ بھی پشاور سی ایم ایچ سے آیا تو چہرے پر مسکراہٹ سجائے سو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ میری ملاقات روزِ قیامت میرے بیٹے سے کروائے۔(آمین) شرجیل کو ہم نے پاسنگ

آؤٹ پر گاڑی گفٹ کی تھی ۔ایک دن میں نے کہا کہ مجھے بھی ایک چھوٹی گاڑی چاہئے درس وغیرہ پر جانے کے لئے تو کہنے لگا می میں اپنی گاڑی چھوڑ کر جا رہا ہوں ۔ میں اب اسی گاڑی پر ہی درس کے لئے جاتی ہوں تا کہ میرے بیٹے کے درجات بلند ہوں اور اللہ تعالیٰ اس کو اجرِ عظیم عطا فرمائے ۔

ڈاکٹر شمیلہ شاہد (بہن کیپٹن شرجیل شہید)

19 مئی 2014 کو میرا وہ خواب شرمندہ تعبیر ہو رہا تھا جو میں نے بچپن سے دیکھا تھا یعنی پاک فوج میں شمولیت ۔اس خواب میں ہمیشہ دو Berrets ہی ہوتی تھیں ایک میری اور ایک میرے ہر دل عزیز بھائی کی ۔اب جب کہ وقت آ گیا تھا تو ادھورا خواب ہی پایہ تکمیل کو پہنچا اور ''اک شخص سارے شہر کو ویراں کر گیا'' کے مصداق تعبیر بہت ویران ہے ۔ کیونکہ ہمیشہ کی طرح ایک ہی Berret رہی ہے ۔ پہلے بھائی کی تھی اور اب دو سال بعد میری آئی ۔آرمی میں شمولیت سے پہلے مجھے پاپا کہ وہ الفاظ یاد تھے کہ بیٹا ایک Red-Berret گئی ہے تو دوسری آنی چاہئے ۔15 مئی کو جب میرا کال لیٹر آیا تو پاپا اور بھائی شرجیل شہید کو بتانے بلکہ ان کو مبارک باد دینے ان کے پاس قبرستان گئے اور بعد میں میں بھی گئی ۔ کیونکہ یہ ثمران کی رہنمائی اور طبیعت میں ایک بڑے بھائی سے بڑھ کر اپنے چھوٹے بہن بھائی کے لئے پدرانہ شفقت کا نتیجہ تھا کہ آج ہم کامیابی کے اس پہلے زینے پر تھے جس کے بارے میں وہ ہمیشہ فکرمند رہتے ۔اکثر ہمیں سمجھاتے ہماری غلطیاں سدھارتے اور کبھی ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتے ۔میری Joining والے دن گھر والے ہاسٹل چھوڑنے ساتھ آئے اور بھائی کے بعد ان دو سالوں میں خوشی اور آرام کا جو پل آیا اس میں بھائی ہمیشہ شامل رہتے ۔اب کی بار بھی سب کی آنکھیں نم تھیں ۔ پہلے دن تو مجھے بس مختلف فارم بھرنے تھے حالانکہ بچپن سے لے کر کالج تک میرے سارے فارم اکثر بھائی ہی بھرتے تھے ۔مگر اب سارا کچھ مجھے خود پر کرنا تھا بلکہ بہن بھائیوں کے خانے میں شرجیل بھائی کے نام اور یونٹ کے ساتھ شہید بھی لکھنا تھا ۔ میں عملی زندگی میں قدم رکھ چکی تھی اور سٹوڈنٹ لائف

سے ایک دم بہت بڑا فرق لگ رہا تھا۔اب سب کچھ مجھے خود کرنا تھا۔کیونکہ ایک مشفق بھائی کی شفقت کا سایہ میرے سر پر نہیں رہا۔ہر چھوٹے سے چھوٹے کام میں مجھے بھائی کی رہنمائی کی اشد ضرورت ہوتی ہے کیونکہ پہلے بھی ہر کام میں بھائی کا مشورہ ہوتا اور ہمیشہ درست اور مخلص مشورہ ہوتا۔اس کا اندازہ مجھے اب ہوا جب بار ہا میرا بھائی کو وانا فون ملانے کو دل چاہتا اور یہاں کے مختلف احوال حتیٰ کہ ڈرل پی ٹی اور فائرنگ کے بارے میں بتانے کو جی چاہتا اور یہ پوچھنے کا بھی کہ آپ لوگ یہ سب کیسے کرتے تھے۔پی ایم اے میں آج جس لیکچر ہال میں بیٹھی ہوں، وہاں سے میری ایک پرانی دوست نے مجھے میسج کر کے بتایا تھا کہ آج ایک سر آئے اور کیپٹن شرجیل کی شہادت کے بارے میں بتا رہے تھے، میں بہت فخر محسوس کر رہی تھی، اللہ انہیں بہترین اجر دے۔ میں سوچ رہی تھی کہ آپ سب ان کی شہادت پر کتنا فخر محسوس کرتے ہوں گے۔ہم سب کو اپنے بھائی کی زندگی اور ان کی شہادت پر فخر ہے۔اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ انہیں اس رتبے کے لئے چنا اور ہمیں ان کا خاندان چنا۔بھائی اپنی کیڈٹ لائف میں ہی صدقہ خیرات کرتے۔ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بھی اپنی باؤس جاب کا معاوضہ بھائی کے نام کا ہی صدقہ کرتی اور اب کیڈٹ بن کے بھی ان ہی کے لئے کوشش کرتی ہوں کیونکہ کسی طور بھی ہم اپنے بھائی کا حق نہیں ادا کر سکتے۔ مجھے لوگ کہتے ہیں کہ پیسہ خرچ کرنے کے لئے ہوتا ہے چاہے فنکشن کے لئے مہنگے ڈریسز خرید کر کرو مگر میری ترجیح صرف بھائی ہیں۔ابھی کچھ دن گزرے ایک محفل میں لوگوں کا ہجوم تھا اور ہر طرف رنگ اور خوشیاں بکھری تھیں مگر جب اندر کی دنیا ویران ہو تو باہر کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ میری ہر خوشی، ہر ہنسی، ہر اداسی میں بھائی ہمیشہ ساتھ ہوتے ہیں۔حتیٰ کہ بھائی کی یادوں سے جڑا کوئی نہ کوئی بندہ آس پاس ہوتا ہے۔مجھے یاد ہے، چھوٹے بھائی کو پچھلے سال پی ایم اے جاتے ہوئے، میں نے ان الفاظ میں تسلی دی تھی کہ دیکھو، شرجیل بھائی نے اپنے 9Div کے کمانڈنٹ تک پی ایم اے بھجوا دیئے ہیں جو بعد میں کوہاٹ سے پی ایم اے پوسٹ ہو گئے اور اب میرے تربیتی ادارے کے کمانڈنٹ بھی بھائی کی طرح کوہاٹین (کیڈٹ کالج کوہاٹ) ہیں۔

اسی طرح ہاؤس جاب کے دوران ایک مریض کو ایم ایچ لے جاتے ہوئے ایمبولنس ڈرائیور جو ساتھ تھا، اس نے بتایا کہ میں نے شرجیل صاحب کو ریسیو کیا تھا اور کچھ ہفتوں بعد چھوڑنے بھی میں ہی گیا تھا۔ آج کل کسی کانفرنس میں یا ہسپتال میں جب بھائی کے کورس میٹ نظر آتے ہیں تو یہ سوچ ذہن میں آتی ہے کہ بھائی ہوتے تو اب تک ان کا ہارڈ ایریا ختم ہو چکا ہوتا اور وہ بھی یہاں ہوتے مگر یہ ایک بہت تلخ حقیقت ہے کہ اب وہ کبھی ہمارے درمیان نہیں ہوں گے۔

وہ مجھے آرمی میڈیکل کالج سے اکثر واپسی پر لینے آتے تھے۔ ایک دفعہ جب ہم ساتھ گھر آ رہے تھے تو میں نے مذاق سے پوچھا کہ شادی کب کرنی ہے تو کہنے لگے کہ میں ہارڈ ایریا کاٹ لوں، پھر کرنا میری شادی۔ بس اب ہماری یہی دعا ہے کہ بھائی جنت الفردوس میں ہمیشہ خوش رہیں۔ آمین! بے شک بھائی کی یاد ہر چیز میں سمائی ہوئی ہے۔ پچھلے ہفتے CCD خریدتے ہوئے بھائی یاد آ گئے۔ ہر یونیفارم میں خوب لگتے تھے، حتیٰ کہ ان کے جی او سی نے کہا تھا کہ He was a handsome officer مگر CCD تو بنی ہی بھائی کے لئے تھی، جس میں ہم نے ان کو صرف تصویروں میں ہی دیکھا، وہ بھی شہادت کے بعد۔ ان کی ایک CCD بالکل نئی واپس آ گئی جسے ان کو پہننے کا موقع بھی نہ ملا۔ اور دوسری جو شہادت کے وقت زیب تن تھی، جسے میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا اور چھوٹے بھائی نے بتایا کہ خون لگا ہوا تھا۔ ایک شہید کا پاک لہو۔ بھائی نے بہت شوق سے DMS بھی بنوائے تھے۔ وہ بھی ہم نے تصویروں میں ہی انہیں پہنے دیکھا۔ چھوٹے بھائی کی پی ایم اے ٹریننگ کے دوران چودہ اگست کے ایک انٹرویو میں ایک اینکر نے پوچھا کہ بڑے بھائی کی شہادت کے بعد بھی آپ کو فوج میں بھیجتے ہوئے آپ کے گھر والوں کو ڈر نہیں لگا تھا۔ اب تو لوگ میرے فوج میں جانے کے بعد مزید سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے مگر ہمارے حوصلے اور بلند ہو گئے ہیں۔ مجھے کئی لوگوں نے فوج میں نہ آنے کا مشورہ بھی دیا تھا بلکہ میرے کئی اساتذہ نے مخلصانہ مشورہ دیا کہ ابھی تم جذباتی ہو، مت آؤ۔ مگر میں اس جگہ کو کیسے چھوڑوں، جہاں کبھی میرا بھائی چلتا تھا۔ میری پسندیدہ شخصیت اب میرا بھائی ہی ہے اور اسی فوجی

ادارے میں اکثر ان کا نام سننے کو مل جاتا ہے کہ آپ کے بھائی بہت اچھے انسان، خوبصورت، ہنس مکھ شخص اور ایک قابل ڈاکٹر تھے۔ 14 ستمبر کو پاسنگ آؤٹ کے لئے ایبٹ آباد روانگی ہے اور مہمانوں کی فہرست میں میرے سب سے اہم مہمان کا نام ہی شامل نہیں ہوگا۔ چھوٹا بھائی اپنی پاسنگ آؤٹ کے وقت کہتا تھا کہ شرجیل بھائی کے بغیر بالکل بھی مزہ نہیں آئے گا۔ اور اب اس چیز کا مجھے بھی شدت سے احساس ہو رہا ہے اور مجھے پتا ہے کہ پاسنگ آؤٹ والا دن ہم سب گھر والوں کے لئے خوشی، فخر اور ایک بہت بڑے خلا اور کمی کے درد کا امتزاج ہوگا اور مسکراتے چہروں اور نم آنکھوں کے ساتھ ایک لمحہ اور گزر جائے گا۔ کیونکہ دو بہت اہم لوگ ایک میرے بھائی شرجیل اور دوسری میری نانی اماں (جو بھائی کے بعد چھ مہینے کے اندر اندر اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ اللہ ان دونوں کو جنت الفردوس میں خوش رکھے! آمین) ان دونوں کو مجھے یونیفارم والی ساڑھی میں دیکھنے کا بہت شوق تھا، وہ اب مجھے یونیفارم میں کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ میرا اور میرے چھوٹے بھائی کا ایک خواب اور بھی تھا کہ بڑے بھائی کے ساتھ یونیفارم میں ہماری ایک تو تصویر ہوتی مگر یہ خواب بھی کبھی پورا نہیں ہوگا۔ اب ہمیں باقی ماندہ زندگی اپنے بہت پیارے بھائی کی یادوں کے سہارے ہی بسر کرنا ہوگی اور یہی ایک تلخ حقیقت ہے اور قدرت کا فیصلہ ہے جس پر سرِ تسلیم خم کرنا ہی اصل بندگی ہے۔

*****

من جانباز م کا آ کاش

محمد امجد چوہدری

.....•••.....

آپریشن ضرب عضب کے دوران پاک فورسز میران شاہ میں دہشت گردوں کے نیٹ ورک کو نیست و نابود کر چکی تھیں۔ دہشت گرد ایسی غار نما لمبی لمبی سرنگوں میں پناہ گزین تھے کہ جہاں اسلحے اور گولہ بارود کی فراوانی تھی۔ بم بنانے والی فیکٹریاں بھی دریافت ہوئیں۔ دہشت گردوں کے خلاف اتنی بڑی کامیابی پر پاک فوج کا ہر افسر اور جوان خوش تھا۔قوم کو بھی اس کامیابی کی اطلاع مل چکی تھی اور دہشت گردوں کے خلاف کامیابیوں پر ہر کوئی انہیں خراج تحسین پیش کر رہا تھا۔سپیشل سروس گروپ کے کیپٹن آ کاش ربانی اور ان کے ساتھیوں نے دہشت گردوں کے خلاف ان کامیابیوں میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ انہی کی جرأت و بہادری کی بدولت دہشت گردی کے مضبوط نیٹ ورک کو ناکارہ بنایا جا چکا تھا۔ پاک فوج نے جب میران شاہ میں دہشت گردوں کے تربیتی مراکز اور خودکش بمباروں کی تیاری کا کھوج لگایا اور وہاں سے بھاری مقدار میں اسلحہ و گولہ بارود برآمد کیا تو کیپٹن آ کاش اور اس کے ساتھی اس کامیابی پر بے حد خوش تھے۔

ماں نے خیر خیریت کے لئے آ کاش سے رابطہ کیا تو اس نے فون اٹھاتے ہی ماں کو اپنی کامیابیاں بتانا شروع کر دیں۔"ماں! ہم نے یہ کیا، ماں ہم نے وہ کیا۔ میرے ساتھی ڈٹے ہوئے ہیں، انشاءاللہ دہشت گردوں کو شکست دے کر لوٹیں گے۔" وہ بولتا رہا، ماں سنتی رہی۔لیکن

وہ بیٹے کی آواز سننے کے باوجود بے چین تھی۔آکاش کےفون رکھتے ہی بولیں:''اس لڑکے کوگھر کی کوئی فکر نہیں، ماں کی فکر نہیں بلکہ اپنی بھی فکر نہیں رہی۔وہ تو صرف آپریشن کی بات کرتا ہے اور کامیابی کے لئے دعا کرنے کو کہتا ہے۔وہ اپنی بات کیوں نہیں کرتا۔اپنی خیریت کیوں نہیں بتاتا۔ ہے کوئی فکر اسے ہماری بھی....؟''ماں کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔آکاش کے والد ڈاکٹر ربانی نے معاملہ بھانپتے ہوئے تسلی دی:''کل پھر بات کرلینا،صبح ہوگی تو پھر خیر خیریت پوچھ لینا۔''

اس رات جب قوم میران شاہ کو دہشت گردوں سے پاک کرنے کی اطلاع اپنی ٹی وی سکرینوں پر سُن رہی تھی،پاک افواج اپنے اگلے ہدف میر علی کی طرف پیش قدمی کر چکی تھیں۔اس علاقے کے مضافات میں بھی دہشت گردوں کے مضبوط ٹھکانے موجود تھے۔فورسز کو بھی ان کی موجودگی کی اطلاع تھی اوران کی جانب سے انہیں مزاحمت کی بھی توقع تھی۔فورسز نے جب زمینی کارروائی کا آغاز کیا توان کے خدشات کے عین مطابق دہشت گردوں نے شدید مزاحمت شروع کردی۔میران شاہ سے 30 کلومیٹر دور احمد خیل کا علاقہ ہے۔15 جولائی کو جب فورسز کے دستے یہاں کے پُر پیچ راستوں سے گزر رہے تھے،تو دہشت گردوں کے ایک بڑے جتھے نے ان پر حملہ کردیا۔قافلے میں اس وقت کئی گاڑیوں کے علاوہ تین سو سے زائد جوان اور ساز وسامان موجود تھا۔حملہ اتنا شدید اور اچانک تھا کہ اس میں فورسز کو شدید نقصان کا خطرہ لاحق ہوگیا۔دونوں اطراف سے فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا اور قافلہ اس میں پھنس کر رہ گیا۔شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔قافلے کو دہشت گردوں کے چنگل سے نکال کر اس کی پیش قدمی کو یقینی بنانے کے لئے کیپٹن آکاش کو ذمہ داریاں سونپی گئیں۔حکم ملتے ہی کیپٹن آکاش اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچے اور دہشت گردوں کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔ایس ایس جی کے جوانوں کی آمد سے دہشت گردوں کی مزاحمت دم توڑ گئی اور وہ بھاگنے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔قافلہ جانب منزل گامزن ہوگیا جبکہ کیپٹن آکاش اوران کے جانباز ساتھیوں نے مزاحمت کا سلسلہ جاری رکھا۔اس موقع پر

کہ جب وہ اپنے مشن کی تکمیل کے بعد اپنے زخمی ساتھیوں کو منتقل کر رہے تھے کہ گولیوں کی ایک بوچھاڑ ان کا سینہ چیرتے ہوئے گزر گئی۔ کیپٹن آکاش زخمی ہوکر زمین پر گر پڑے۔ انہوں نے دہشت گردوں کے چنگل سے نکالے جانے والے قافلے پر نظر دوڑائی تو وہ جانب منزل رواں دواں تھا۔ مطمئن ہوکر انہوں نے آنکھیں بند کرلیں اور شہادت کی منزل حاصل کر لی۔ اس حملے میں ان کا ایک اور ساتھی بھی شہید ہوا تھا۔ آکاش اپنی منزل پا چکا تھا۔ وہ منزل جس کا تعین اس نے ایبٹ آباد سکول میں کیا تھا۔ ''کردار ہی منزل ہے۔'' آج اس نے اس ماٹو کا عملی مظاہرہ کر کے اپنی درس گاہ، والدین اور اساتذہ کا سر فخر سے بلند کر دیا تھا۔

کیپٹن آکاش نے 12 اکتوبر 1990 کو ایبٹ آباد میں آنکھ کھولی تھی جس کی فضائیں ہر وقت افواج پاکستان کے جری افسروں اور جوانوں کے نعرۂ تکبیر سے معطر رہتی ہیں۔ آکاش کا گھر پاکستان ملٹری اکیڈمی سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ اس طرح اس عسکری ماحول کی وجہ سے وہ پیدا ہوتے ہی پی ایم میں داخل ہو گیا تھا۔ اس نے وطن کے رکھوالوں کو تربیت کے مراحل سے گزرتے، دیکھتے جوانی میں قدم رکھا تھا۔ اسے جنٹلمین کیڈٹ بہت بھاتے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے والد اور بڑے بھائی کا، جن کا شمار ایبٹ آباد کے معروف معالجین میں ہوتا ہے، پیشہ اختیار کرنے کی بجائے فن سپہ گری میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔

آکاش 123 ویں پی ایم لانگ کورس میں منتخب ہوا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ 19 اپریل 2009 کو اس کے والدین اسے پی ایم اے کے گیٹ پر الوداع کہنے آئے تھے۔ ایبٹ آباد کے باسی ہونے کے ناتے ان کے لئے یہ ماحول اجنبی نہ تھا۔ وہ اپنے اردگرد زرق برق وردیوں میں ملبوس جنٹلمین کیڈٹس، افسروں اور جوانوں کو اکثر دیکھتے۔ ان کے لئے یہ معمول تھا لیکن اب جبکہ ان کا بیٹا اکیڈمی میں داخل ہو رہا تھا تو ان کے معمولات کی تمام چیزیں یکا یک غیر معمولی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ ماں نے اکیڈمی کے گیٹ کی طرف قدم بڑھاتے آکاش کو پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی مگر تمام توانائیوں کے باوجود ایسا نہ کر سکی۔ ڈاکٹر ربانی نے ان کے دل

کی حالت کا اندازہ لگا کر سمجھایا۔

وہ دور نہیں گیا قریب ہی تو ہے۔

ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارا بیٹا ہمارے قریب رہ کر تربیت مکمل کرے گا۔ ورنہ تو ایسے والدین بھی ہیں کہ جن کے لختِ جگر کوسوں میل دور سے یہاں آئے ہیں۔

ماں کو تسلی ہوئی لیکن اب بھی اس کی دھڑکنیں تیز چل رہی تھیں، وہ بے چین تھی۔

واقعی وہ ماں بے چین ہو جاتی ہے جس کا بیٹا تحفظ وطن کی قسم اٹھاتا ہے۔ ماں کے لئے بیٹے سے قیمتی کوئی متاع نہیں ہوتی۔ مگر وہ متاع پاک فوج کی وردی زیب تن کر لے تو قوم کی امانت بن جاتی ہے۔ ماں یقیناً قریب تھی لیکن اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کا بیٹا قریب رہتے ہوئے بھی اس سے بہت دور ہو گیا ہے۔

ماں نے صبر کر لیا۔

اگر یہ مائیں صبر نہ کریں، اپنے بیٹوں کو دور نہ کریں تو وطن کی حفاظت کون کرے گا۔ وہ وطن کی خاطر دل پر پتھر رکھ لیتی ہیں۔ تیار ہو جاتی ہیں ہر آفت کے لئے ہر خبر کے لئے۔ جب یہ بیٹے محاذ پر دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوتے ہیں تو ان کی مائیں، بہنیں، بیٹیاں اور بیویاں اپنی آنکھوں سے بہتے قطروں پر کس طرح قابو پاتی ہیں، یہ صرف وہی جانتی ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیاروں نے ملک وملت کی غیرت اور آزادی کے لئے قربانیاں دی ہیں۔ وطن کے لئے بیٹا وقف کر کے آکاش کی ماں نے بھی قربانی دی تھی۔ مگر وہ اس کی جدائی میں اپنی ممتا کی پیاس کیسے بجھائے گی؟ یہی سوچ سوچتے وہ گھر آ گئی۔

کیپٹن آکاش نے پاکستان ملٹری اکیڈمی میں 123 پی ایم لانگ کورس کی قاسم کمپنی کے ساتھ تربیت کے کٹھن مراحل طے کئے۔ 23 اپریل 2011 کو جب وہ قیادت کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو سپہ سالار کے الفاظ کی بازگشت اس کے ذہن سے ٹکرا رہی تھی۔ قیادت کی سیڑھیاں چڑھنا کوئی آسان کام نہیں بلکہ جو ستارے انہوں نے کندھوں پر رکھے ہیں، وہ دراصل وطن عزیز کی

حفاظت وسلامتی کی ذمہ داریاں ہیں جن کو نبھاتے ہوئے انہیں اپنی جان تک کی قربانی بھی دینا پڑے گی۔

پاکستان ملٹری اکیڈمی میں فوجی تربیت کے دوران آکاش کی جسمانی چستی میں ہی اضافہ نہیں ہوا تھا بلکہ ذہنی بالیدگی بھی پروان چڑھی تھی۔اسے پہلے بار احساس ہوا تھا کہ فوجی وردی کی ذمہ داریاں اس کی سوچ سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔اسے یہ بھی حقیقت حال معلوم ہوئی تھی کہ وطن عزیز کی آزادی کو بیرونی خطرات تو تھے ہی، دہشت گردی نے اسے جس قدر نقصان پہنچایا ہے، اس کا اندازہ ممکن نہیں۔آج کی فوجی زندگی صرف کٹھن راستوں کا ایک مسلسل سفر ہے۔ان حالات میں کہ جب دہشت گردوں نے ملک کے بہت سے حصوں میں حکومت کی رٹ ختم کر دی ہے، صرف افواج پاکستان ہی ان کے عزائم کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔پاکستان ملٹری اکیڈمی میں کیڈٹس کو ایسے گر سکھائے گئے تھے کہ وہ اندرونی و بیرونی چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے پوری طرح تیار تھے۔کیپٹن آکاش ربانی اور ان کے ساتھی عزم کر چکے تھے کہ پاکستان کے وجود کے خلاف اٹھنے والے ہر ہاتھ کو وہ کاٹ کر رکھ دیں گے۔

پاسنگ آؤٹ پریڈ کے بعد جب ماں نے آکاش کو اپنی آغوش میں لیا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ بے چین ہوگئی۔جو خدشہ اس نے اپنے دل میں پالا تھا، حقیقت بن کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔آکاش اب اس کا بیٹا نہ رہا تھا بلکہ وہ قوم کا بیٹا بن چکا تھا۔اس کی سوچ اور خیالات گھر کے آنگن سے نکل کر دھرتی کی وسعتوں کو چھو رہے تھے۔ماں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔یہ میرا وہم ہے، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔انہوں نے کو خود دل ہی دل میں تسلی دی اور گھر لوٹ آئیں۔آکاش پاک فوج کا لیفٹیننٹ بن چکا تھا۔فوجی زندگی اپنانے کے بعد اس کے طور اطوار تبدیل ہو چکے تھے۔اس کی سوچ سنجیدہ اور پختہ ہو چکی تھی۔اس کی فکر گھر سے نکل کر پاکستان کے کونے کونے تک جا پہنچی تھی۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب ایک صبح آکاش نے اپنی ماں سے اجازت چاہی۔"ماں آج

یونٹ جائن کر رہا ہوں، اپنی عملی زندگی کا آغاز کروں گا۔'' آکاش کو پاسنگ آؤٹ کے بعد 47 فیلڈ رجمنٹ آرٹلری میں تعینات کیا گیا، جس کا حصہ بن کر وہ فخر محسوس کر رہا تھا۔ یونٹ اس وقت کھاریاں میں تھی۔ یونٹ میں اس کا استقبال روایتی انداز سے کیا گیا۔ بہت جلد یونٹ میں بھی اس نے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانا شروع کر دیئے۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں اس نے کامیابی کے جھنڈے نہ گاڑھے ہوں، یونٹ میں بھی اس نے اپنی محبت لگن اور بہادری سے ہر افسر اور جوان کے دل میں گھر بنا لیا تھا۔ ہر کوئی اس کا گرویدہ ہو چکا تھا۔ ہر کسی نے اس میں ایک بے چینی محسوس کی تھی۔ وہ ایک منزل کے بعد دوسری منزل کا متمنی تھا۔ اس کی یہی تڑپ اور بے کلی اسے آرٹلری رجمنٹ سے سپیشل سروسز گروپ میں لے گئی۔ ایس ایس جی کا نام آتے ہی دل دماغ میں جرأت، بہادری، عزم، ہمت، مردانگی، دلیری اور قوت کے استعارے ابھرنے لگتے ہیں۔ جسم میں بجلیاں کوندنے لگتی ہیں۔ پہاڑ دہلنے لگتے ہیں۔

من جانبازم

وہ ایس ایس جی کے آکاش پر نمودار ہوا تو اس کی عزم و ہمت کے ستارے اور بھی چمک اٹھے۔ یہاں کے تربیتی مراحل غیر معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ بس سمجھ لیجئے کہ آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔ ایس ایس جی پاک فوج کا ایک ایسا عسکری شعبہ ہے جس میں من کی مراد سے کٹھن زندگی کو لبیک کہا جاتا ہے۔ کیپٹن آکاش کے دل میں پی ایم اے کی سیڑھیاں چڑھتے ہی من جانبازم بس گیا تھا۔ 2013 میں ایس ایس جی میں منتخب ہوا، تو اسے یوں لگا کہ اس کے دل کی مراد پوری ہوگئی۔

''کردار ہی منزل ہے۔'' اس کی ابتدائی درس گاہ نے اسے جو درس دیا تھا، اس کے عملی مظاہرے کے لئے یہی میدان کارگر تھا۔ ایس ایس جی کو جائن کرنے والے ہر افسر و جوان کی منزل ہی کردار رہتا ہے۔ قوم و ملت کے لئے جان دینا ہی ان کا طرہ امتیاز ہوتا ہے۔ آکاش نے ایک تقریب کے دوران والدین اور بھائی کو تربیلا آنے کی دعوت دی۔ اس دن وہ بہت خوش تھا۔

اسے اپنی نئی وردی پر بے حد ناز تھا۔اس نے پھر ماں کو اپنی تربیت کے مقاصد بتانے شروع کر دیئے۔اس کی آنکھوں میں ایسی چمک نمودار ہوئی کہ ماں بھی اس کی تاب نہ لاسکی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔اس کی دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوگئیں۔وہ سمجھ گئی کہ اس کے تمام وہم دراصل حقیقت ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اس کے بیٹے کو واقعی اس دھرتی کے لئے چن لیا ہے۔

کیپٹن آکاش نے جونہی اپنے لہو سے ایس ایس جی کے عہد وفا پر دستخط کئے، نئی منزل اس کی منتظر تھی۔وطن عزیز کو دہشت گردوں نے گزشتہ کئی سال سے جس طرح اپنی مذموم سرگرمیوں کا مرکز بنایا ہوا ہے اس نے پاکستان کے وجود کی سنگین خطرات سے دوچار کر دیا تھا۔اس کی بیخ کنی کے لئے شروع ہونے والے فیصلہ کن آپریشن ضرب عضب اس کی منزل تھی۔کیپٹن آکاش کو خصوصی ٹاسک فورس میں شامل کر کے شمالی وزیرستان میں فرائض سونپے گئے۔ضرب عضب کا آغاز 15 جون کو ہوا تھا۔ٹھیک ایک ماہ بعد 15 جولائی کو کیپٹن آکاش اپنے سونپے ہوئے مشن کی تکمیل کے بعد شہادت کی منزل سے ہمکنار ہوئے۔

''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا'': شہید کا جسد خاکی ایبٹ آباد پہنچا تو وہاں کی فضاؤں نے اسے خوش آمدید کہا۔کیپٹن آکاش کی ماں نے تربیلا میں اپنے بیٹے کی آنکھوں میں جو چمک دیکھی تھی، حقیقت کا روپ دھار چکی تھی۔کیپٹن آکاش کا قومی پرچم میں لپٹا جسد خاکی یہ گواہی دے رہا تھا کہ اس نے اپنے خاندان کے لئے نہیں بلکہ پوری قوم کے لئے یہ قربانی دی ہے۔اس کی ماں کے دامن میں شہید کی صرف یادیں رہ گئیں تھیں۔ماں کو اس نے آج وہ چادر دی تھی جس پر ستارہ وہلال کندہ تھے۔من جانباز م کا طرہ کہہ رہا تھا کہ ماں دیکھا میں نے پوری قوم کا بیٹا بن کر دکھا دیا۔

قوم بھی اپنے ان بیٹوں کی قدر کرتی ہے۔کیپٹن آکاش پاک فوج کے ان تمام بیٹوں کی علامت ہے جنہوں نے اس وطن کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دیں۔کیپٹن آکاش ربانی نے اپنی ماں کے سامنے تو کبھی اپنے جذبات کا اظہار نہ کیا تھا تاہم فیس بک پر ایک دفعہ انہوں نے ایک

سوال کے جواب میں لکھا تھا: ''تم ہزاروں پاکستانی فوجیوں کی شہادت کو احترام کی نظر سے دیکھو نہ دیکھو لیکن کیا تم ان ماؤں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکتے ہو کہ ان کے بیٹوں نے کس کے لئے اپنی جان دی۔ کیا تم ان کے بچوں کو بتا سکتے ہو کہ ان کے باپ نے اپنی جانیں کیوں قربان کیں اور یہ سب کچھ لکھتے وقت تم اپنے گھر کے آرام دہ بستر پر بھی بیٹھے ہو .... اللہ ہی بہتر انصاف کرنے والا ہے۔''

*****

جان سے بھی پیارا

اہلیہ لیفٹیننٹ کرنل انور عباس شہید

.....◆◆◆.....

لیفٹیننٹ کرنل انور عباس بٹ کا تعلق صوبہ پنجاب کے شہر گجرات سے تھا۔ وہ 28 جنوری 1971 کو ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ آپ کی پیدائش پر آپ کے والد نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ میرا بیٹا بڑا ہوکر فوجی آفیسر بنے گا۔ ان کا کئی نسلوں سے افواج سے تعلق تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم زمیندارہ کالج سے حاصل کی اور فوج میں کمیشن کے لئے اپلائی کیا اور کامیاب ٹھہرے۔ پی ایم اے سے پاس آؤٹ ہونے کے بعد 50 بلوچ رجمنٹ جائن کی۔ شروع سے ہی دفاع وطن کے جذبے اور خاکی وردی سے محبت نے انہیں یونٹ کے ہر کام اور ہر مشن میں آگے رکھا اور اپنی زندگی میں خضدار، گوادر، کوئٹہ، مری، راولپنڈی، کھاریاں، آزاد کشمیر، گوجرانوالہ، بہاولپور، سوات، ہنگو اور اورکزئی ایجنسی میں خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ آپ نے ایک سال UN مشن پر سرالیون میں بھی خدمات انجام دیں۔ 2007 میں ان کی یونٹ سوات کی جنت نظیر وادی میں اس وقت پہنچی جب یہ حسین دھرتی بدامنی کا شکار تھی۔ انور عباس نے اپنی یونٹ کے ساتھ بحیثیت کمپنی کمانڈر اس آپریشن میں حصہ لیا اور جرأت و بہادری اور استقامت کی ایسی مثال قائم کی کہ علاقے کے لوگ اور دیگر آفیسرز آج بھی آپ کے دلیرانہ کارناموں کا ذکر کرتے ہیں۔ اس آپریشن میں ان کا سامنا کئی مرتبہ موت سے ہوا۔ انہوں نے اپنے کئی عزیز ساتھی، آفیسرز اور جوانوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے شہید

ہوتے دیکھا۔ان واقعات نے ان کا اللہ پر اعتقاد ایمان اور ملک دشمنوں سے نفرت اور ملک اور اللہ کی راہ میں شہادت کا رتبہ پانے کا جذبہ مزید بڑھا دیا۔ میں نے بحیثیت ان کی بیوی ان کو ہمیشہ یہی کہتے سنا۔ "Shumyla, I will never let my kids and my Country down. My kids will always be proud of me. IA" وہ اکثر کہا کرتے تھے: ''شمائلہ! میں ڈر کر بھاگنے والوں میں سے نہیں۔ یہ وطن ہماری قربانی مانگے تو میری جان بھی حاضر ہے۔اور میری کمر یا پشت پر کسی گولی کا نشان نہ ہوگا۔ میں شہید ہوا تو میں تمام گولیاں، انشا اللہ سینے پر کھاؤں گا' اور انہوں نے یہ بات ثابت کر دی کیونکہ صرف بلٹ پروف جیکٹ میں سینے پر 50 گولیاں تھیں۔سوات کے آپریشن میں وہ اپنی بلٹ پروف جیکٹ اتار کر سب سے جونیئر سپاہی کو دیتے کہ جب تک میرے تمام بھائی (سپاہی) نہ پہنیں، میں نہیں پہنوں گا۔اور اگر موت کا وقت لکھا ہے تو بستر پر بھی آ سکتی ہے۔تو پھر ڈر کیسا؟ کرنل انور ایک خوش مزاج، صاف گو اور کھرے انسان تھے۔ ملک سے انتہائی محبت کرتے تھے۔اور ملک میں موجود کرپشن اور دہشت گردی کو ملک کے لئے ناسور سمجھتے تھے۔ان کی شدید خواہش تھی کہ ملک سے ان لعنتوں کا جلد از جلد خاتمہ ہو اور وطن عزیز صحیح معنوں میں ایک اسلامی فلاحی ریاست بنے۔آپ ایک ایماندار اور پابند صوم وصلوٰۃ مسلمان تھے۔زندگی بھر کسی کا احسان نہ لیا بلکہ ہمیشہ دوسروں کی ضروریات اور احسانات کا خیال رکھا۔انور اپنے خاندان اور دوست واحباب میں ہر دلعزیز بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول تھے۔سب لوگ ان سے نہایت محبت کرتے تھے اور ان کی بذلہ سنج طبیعت ان کو سب میں نمایاں کرتی تھی۔ستمبر 2009 میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ملنے کے بعد 2 ونگ سوات سکاؤٹس میں بحیثیت ونگ کمانڈر پوسٹ ہوئے۔ان دنوں 2 ونگ سوات سکاؤٹس خیبر پختونخوا کے ایک انتہائی حساس علاقے ضلع ہنگو میں فرائض انجام دے رہا تھا۔ضلع ہنگو فرقہ واریت کے علاوہ دہشت گردی کی لپیٹ میں بھی آ چکا تھا۔پورے ضلع کے عوام امن وامان کی خاطر دن رات دعائیں مانگتے تھے۔ہنگو میں امن وامان قائم کرنے کے لئے لیفٹیننٹ کرنل انور

عباس بٹ کی زیر نگرانی 2 ونگ نے مختلف اقدامات کئے جن کی بدولت وہاں امن قائم ہوا اور شہریوں نے سکون کا سانس لیا۔ ہنگو کے بچے بوڑھے اور جوان آج بھی کرنل انور عباس بٹ کے گن گاتے نظر آتے ہیں۔ کرنل انور عباس بٹ نے ہنگو کے بازار تیراہ اڈا سے ایک خودکش بمبار گرفتار کیا جو فرنٹیئر کانسٹیبلری کا ملازم تھا اور تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ اس کا ہدف اسلام آباد تھا۔ ہنگو میں امن وامان قائم ہونے کے بعد مارچ 2010 میں آپ کو 2 ونگ کے ساتھ آپریشن ''خوخ بہ دے شم'' میں حصہ لینے کے لئے اورکزئی ایجنسی جانے کے احکامات موصول ہوئے۔ اس اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے آپ نے تیاری کی اور ہیڈکوارٹر بالا حصار کا دورہ کیا تا کہ آپریشن کے لئے احکامات سمجھ لیں۔ وہاں پر ایک آفیسر سے گفتگو کے دوران آپ نے کہا، ''انشاءاللہ، اورکزئی ایجنسی کا پہلا شہید میں ہوں گا۔'' جانے سے پہلے اپنی بھتیجی کی شادی جو کہ ان کی شہادت سے ایک مہینہ پہلے ہوئی، تمام دوست احباب اور رشتہ داروں سے آخری ملاقات ہوئی۔ الوداعی ملاقات میں ان کی بڑی بہن ان سے ملتے ہوئے رو پڑیں جو اس وقت بیمار تھیں، تو آپ نے کہا: ''نیلوفر، ہمت کرو، کل کو آپ نے شہید کی بہن بن کر انٹرویو نہیں دینا کیا؟'' 14 مارچ 2010 کو لوئر اورکزئی کلایہ ہیڈکوارٹر کی ریکی کی گئی۔ کلایہ کے حساس علاقوں سام فیروزخیل میں دہشت گردوں کی وجہ سے لوگ نقل مکانی کر رہے تھے۔ اورکزئی ایجنسی جانے سے پہلے ایک مختصر دربار میں جوانوں سے کہا: ''میں آپ لوگوں میں سے ہوں اور ہم سب پاکستانی فوج کے سپاہی ہیں۔ ہمیں ہر وقت ملک کی خاطر قربانی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ انشاءاللہ، میں ہر مشکل وقت میں آپ لوگوں سے آگے ہوں گا کیونکہ ملک کی سلامتی کے لئے ہم جان کی قربانی سے بھی گریز نہ کریں گے۔'' 21 مارچ 2010 کو دیئے گئے مشن کی تکمیل کی خاطر 2 ونگ اور کرنل انور عباس بٹ کلایہ ہیڈکوارٹر لوئر اورکزئی پہنچ گئے اور فوراً ہی نزدیکی چوٹیوں پر قبضہ کرنے کے بعد دیگر علاقوں مثلاً شنہ ناکہ، بیروٹی، فیروزخیل اور میربک میں دہشت گردوں سے لڑتے ہوئے ان کو بھگا دیا اور اہم پوسٹوں پر قبضہ کر لیا۔ پھر فوجی پوسٹیں لگانے کا کام شروع کر دیا۔ اس تمام مشن کو

ناکام بنانے کے لئے اور حکومتی عملداری کو چیلنج کرنے کے لئے ایجنسی کے سارے دہشت گردوں نے منظم ہوکر 25 اور 26 مارچ کی درمیانی رات بیک وقت 2 ونگ کی تمام پوسٹوں اور بٹالین ہیڈکوارٹر پر حملہ کردیا۔ یہ بات سنتے ہی کرنل انور عباس بٹ فوراً سریع الحرکت فورس لے کر نزدیکی اوپی کی طرف روانہ ہوگئے۔ 10 منٹ کے بعد اوپی پر دوبارہ 2 ونگ کا قبضہ ہوگیا مگر ایک مورچہ جو ابھی تک دہشت گردوں کے قبضے میں تھا، وہاں سے مسلسل فائر آرہا تھا اور وہاں موجود 5 جوان بھی پھنس چکے تھے۔ ان جوانوں کو بچانے کے لئے کرنل انور نے اس مورچے کی طرف پیش قدمی کی۔ وہ آہستہ آہستہ فائر اینڈ موو (fire and move) کرتے آگے بڑھے۔ تاک تاک کر نشانے لگائے اور مقابل دہشت گردوں کو جہنم واصل کیا۔ آخری مرحلے میں جب وہ اپنے مقصود پر پہنچ گئے تو جست لگائی اور دشمن کے سر پر جا پہنچے۔ نزدیکی لڑائی بہت شدت سے شروع ہوگئی۔ وہ سامنے آنے والے دشمن پر پل پڑے کہ نزدیک چھپے ایک دشمن نے اپنا فائر کھول دیا۔ کئی گولیاں جسم کو چھلنی کر گئیں مگر وہ اپنا فریضہ ادا کر چکے تھے اور زخموں کی تاب نہ لاکر انہوں نے موقع پر جام شہادت نوش فرمایا۔ انہوں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے کلایہ ہیڈکوارٹر اور دیگر اردگرد کی پوسٹیں دہشت گردوں کے قبضے میں جانے سے بچالیں اور اس دوران زخمی ہونے کے باوجود لاتعداد دہشت گردوں کو جہنم واصل کیا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے لئے عزت کی موت کی تمنا کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ خواہش اس طرح پوری کی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امر ہوگئے۔ 26 مارچ 2010 کو آپ کو آرمی قبرستان راولپنڈی میں پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا۔ آپ کی اس بہادری کے صلے میں حکومت پاکستان نے مارچ 2011 میں آپ کو ستارۂ بسالت عطا کیا۔ کرنل انور اپنے تینوں بیٹوں عبداللہ بٹ، عبدالقیوم بٹ اور عبدالرحمن بٹ کے لئے ایک نہایت شفیق باپ تھے اور مجھ پر ان کے اعتماد کا یہ حال تھا کہ کہتے: ''میری وائف ایک بہادر ڈاکٹر ہے۔ اگر مجھے کچھ ہوجائے تو میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ خود کو اور میرے بچوں کو سنبھال لے گی۔'' وہ اپنی والدہ کے سب سے چھوٹے اور لاڈلے بیٹے تھے اور میں نے ہمیشہ انہیں اپنی والدہ کی گود

میں سر رکھ کر باتیں منواتے دیکھا۔ان کی شہادت کے وقت ان کے بیٹوں کی عمریں 5 سال 3 سال اور ایک سال تھیں۔ان کے تینوں بیٹے اپنے بابا پر فخر کرتے ہیں اور اپنے بابا کی طرح اس ملک کی خدمت پاک آرمی جوائن کر کے کرنا چاہتے ہیں۔مجھ سے ہمیشہ کہتے کہ اگر میں شہید ہو جاؤں تو میری وصیت یاد رکھنا کہ آپ ایک فوجی کی بیوی ہیں،جس طرح آپ نے زندگی میں ہر قدم پر میرا ساتھ دیا،اسی طرح میری شہادت کو اپنے اور میرے بیٹوں کے لئے احساس محرومی نہ بنانا بلکہ اس کو ان کے لئے باعث فخر بنانا۔اور یہ کہ اگر پاکستان پر جان قربان کرنے کا کبھی بھی وقت آیا تو میں کبھی پیچھے نہیں ہٹوں گا کیونکہ

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میرے موبائل میں محفوظ یہ آخری میسج جوانہوں نے اپنے تمام رشتہ داروں کو کیا، وہ یہ تھا جو ان کی قبر کے کتبہ پر بھی تحریر ہے۔شہادت سے ایک رات قبل میرا منجھلا بیٹا عبدالقیوم رات کو ڈر کر اٹھ گیا۔صبح اس نے اپنے بابا کو بتایا کہ میں نے خواب میں پانی میں دو لال سانپ دیکھے ہیں۔ان میں سے بڑے سانپ نے آپ کو کاٹ لیا ہے۔آپ جلدی گھر آ جائیں، مجھے آپ کی یاد آ رہی ہے۔اس بات پر انور عباس نے مجھے کہا،'' عبدالقیوم نے لگتا ہے میرے بارے میں سچا خواب دیکھ لیا ہے۔اگر مجھے کچھ ہو جائے تو عبدالقیوم کو نہ بتایا جائے تاکہ وہ ہمیشہ مجھے زندہ سمجھتا رہے''اور اس بیٹے نے ان کی شہادت کے بعد پورا سال بولنا اور کھانا پینا چھوڑ دیا تھا اور ہر وقت چھپ کر بابا کو فون کرتا رہتا تھا۔میں جب کافی عرصے کے بعد بچوں کو بابا کی قبر پر لے کر گئی تو عبدالقیوم نے کہا:'' مجھے پتا ہے کہ بابا یہاں رہتے ہیں''اور ایک بنچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:''یہاں میں روز بابا سے خواب میں ملتا ہوں۔'' واقعی شہید زندہ ہوتے ہیں اور کرنل عباس بٹ نے اپنی والدہ سے کہا تھا،''ماں جی! میں آپ کو تین مہینوں بعد آ کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ پہلے میں اور کزئی ایجنسی سے واپس آ جاؤں۔'' وہ ماں آج تک کہتی ہیں:''انور آ کر اپنا وعدہ پورا کرو اور

مجھے لے جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' عظیم ہیں وہ مائیں جنہوں نے اپنے جوان سپوت اس ارض پاک پر قربان کر دیئے تا کہ ماں اور بہنوں کے سر پر آنچل سلامت رہے، بچوں کے سروں پر ان کے باپوں کا سایہ رہے اور ملک سے وطن دشمن عناصر کا خاتمہ ہو۔ میرے چھوٹے بیٹے عبدالرحمن نے بابا کہنا، اپنے بابا کی شہادت کے چھ ماہ بعد شروع کیا مگر اس لفظ کو سننے والا شخص اللہ کے پاس تھا۔ جب میرے بیٹے اپنے بابا کے متعلق مجھ سے پوچھتے ہیں تو نہایت فخر سے انہیں بتاتی ہوں، ''بیٹا! آپ کے بابا اس ارض پاک کی سربلندی کے لئے اللہ کی راہ میں شہید ہوئے ہیں اور انشاءاللہ جنت میں اپنے گھر میں رہ رہے ہیں اور اگر ہم بھی نیک کام کریں گے تو انشاءاللہ انہیں جا کر ملیں گے۔'' وہ ایک نہایت شفیق باپ تھے اور بچوں کی محبت میں وہ اکثر کہا کرتے، ''اگر میری اولاد میرا گوشت بھی کاٹ کر رکھ لے تو میں حاضر ہوں۔ میری جان میری اولاد ہے۔'' بچوں کو کھلانا، انہیں کاندھے پر بٹھا کر ہمیشہ جھولا دیتے اور پورے کینٹ میں بچوں کو کندھے پر بٹھا کر سیر کراتے۔ خدا ان کی قربانی قبول کرے اور میرے تینوں بیٹوں کو اس قابل بنائے کہ میں ان کو کرنل انور جیسا بہادر، نڈر، صاف گو اور محب وطن فوجی بنا سکوں اور وہ بھی ملک کے لئے اپنے بابا کی طرح اپنی قربانی پیش کریں اور پاکستان آرمی، اسلام، میرا اور اپنے بابا کا نام روشن کر سکیں اور مجھے فخر ہے کہ میں ایک ایسے انسان کی بیوی ہوں جس نے اپنے فرض کی ادائیگی کو اپنے تمام رشتوں سے افضل سمجھا اور میری کوشش ہوگی کہ میں اپنے بیٹوں کی صورت میں اس قوم کو تین تین کرنل انور عباس شہید تیار کر کے دوں۔ انشاءاللہ۔ آخر میں فقط اتنا ہی:

اے ارض پاک تو نے جسے پکارا تھا
وہ شخص مجھے جان سے بھی پیارا تھا
راہ حیات پہ تنہا کیسے چلوں گی۔۔۔؟
وہی میری امید سحر میری رات کا روشن ستارہ تھا
وہ چاند چہرہ، ہنستے لب، بولتی آنکھیں

وہ جس کا پل پل میں نے صدقہ اتارا تھا
میں نے تن من وار دیا جس پر ہار کر خود کو
اے ارض پاک اس نے خود کو تجھ پہ وارا تھا
وہ دیوانہ تیرے عشق میں کتنا جنون خیز نکلا
اس نے تیری صبح کو اپنے لہو سے نکھارا تھا
اے ارض پاک!تو نے جسے پکارا تھا!
وہ شخص مجھے جان سے بھی پیارا تھا!

*****

سرفروش

زرمینہ مغل

......•••......

بابا۔بابا۔سکاڈرن لیڈراسد ابھی تیار ہو کر کمرے سے نکلا ہی تھا کہ اس کی پانچ سالہ بیٹی پونی ٹیل بنائے سکول یونیفارم پہنے بابا۔بابا۔کہتی بھاگتی ہوئی اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔اسد نے جھک کر اسے اٹھایا اوراس کے ماتھے پہ پیار کرتے ہوئے پوچھا۔جی بابا کی جان! کیابات ہے؟بابا کل ہمارے سکول میں پیرنٹس ڈے ہے۔آپ آئیں گے ناں!ماما کے ساتھ؟ مناہل نے کہا۔اوکے بیٹا میں کوشش کروں گا۔اسد نے جواب دیا۔نہیں بابا آپ آئیں گے بس!مناہل نے کہہ دیا۔مناہل کاانداز روٹھنے والا تھا۔بابااوکے اب تو آرڈر مل گیا ہے میں آ جاؤں گا۔اسد نے ہنستے ہوئے کہا۔پرامس کریں،مناہل نے اپنا ننھاسا ہاتھ آگے بڑھایا۔اوکے پرامس۔اسد نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔پکا والا پرامس ہے نا بابا؟؟ مناہل ابھی تک بے یقین تھی کیونکہ پچھلی دفعہ اسد اپنی ذمہ داریوں کے سلسلے میں مصروف ہونے کی وجہ سے نہیں جا سکا تھا۔ ہاں بیٹا پکاوالا پرامس۔اسد نے مناہل کو یقین دہانی کروائی۔اگر باپ بیٹی کی باتیں ختم ہوگئی ہوں تو ناشتے کی ٹیبل پر آ جائیں ٹھنڈا ہورہا ہے۔مسز اسد نے آواز لگائی۔چلو بیٹا بریک فاسٹ کرتے ہیں ورنہ آپ کی ماما سے ہم دونوں کوڈانٹ پڑ جائے گی۔اسد نے مسکراتے ہوئے مناہل کوچیئر پہ بٹھایا۔اورناشتہ کرتے اپنے ڈھائی سالہ بیٹے کوجھک کر پیار کیا۔میرا جونیئر کیسا ہے۔بابا آئی ایم فائن۔ارسلان نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔نوبابا ہی از ناٹی بوائے۔اس نے میری ڈول کی ایک آرم ہی توڑ دی۔مناہل نے فوراً شکایت لگائی۔آپ دومنٹ ارسلان کو دیکھیں،

دودھ گرا نہ دے، میں آپ کے لئے چائے لے کر آتی ہوں۔مسز اسد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ او کے۔ارسلان بیٹا، آرام سے دودھ پیو آپ۔اور مناہل بیٹا کوئی بات نہیں، ارسلان چھوٹا ہے نا! بابا آپ کے لئے نیو ڈول لے آئیں گے۔اسد نے پہلے ارسلان اور پھر مناہل سے کہا۔اور بابا میرے لئے اڑنے والا پلین لے کر آیئے گا جیسا آپ کے پاس ہے۔ارسلان نے بھی جھٹ سے فرمائش کر دی۔چلیں جی آپ کے بیٹے نے ابھی سے آپ کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا ہے۔مسز اسد نے چائے لے کر آتے ہوئے کہا۔ہاں میرا بیٹا بھی میری طرح پائلٹ بنے گا اور ہمارے پاکستان کی حفاظت کے لئے اپنا فرض نبھائے گا۔اسد نے پیار سے اپنے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔بابا میں بھی پاکستان کی حفاظت کروں گی، بڑی سی گن لے کر۔مناہل نے معصوم سے انداز میں کہا۔ہاں ہاں میری بہادر بیٹی جو ہے۔اسد نے مسکراتے ہوئے پیار سے مناہل کے گال کو چھوا۔چلیں، اب جلدی سے ناشتہ کر لیں ورنہ آپ بھی لیٹ ہو جائیں گے اور مناہل کی سکول وین بھی نکل جائے گی۔مسز اسد نے کہا۔او کے۔چلو بیٹا، ناشتہ ختم کرو جلدی سے۔ناشتے کے بعد مناہل کی وین آ گئی اور سکول جاتے ہوئے ایک دفعہ پھر وہ اسد کو اس کا وعدہ یاد دلانا نہیں بھولی۔ اچھا میں بھی چلتا ہوں۔اسد نے کہا۔کب تک آ جائیں گے، آج آپ؟ مسز اسد نے پوچھا۔آج آنے میں تھوڑی دیر ہو جائے گی، فلائنگ ہے اور ایک میٹنگ بھی ہے۔اسد نے جواب دیا۔ او کے، اپنا خیال رکھیئے گا، فی امان اللہ۔تم بھی اپنا خیال رکھنا۔اللہ حافظ۔۔۔۔۔۔

اے راہِ حق کے شہیدو! وفا کی تصویرو!
تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں
اے راہِ حق کے شہیدو!!

شہر کے ایک مصروف بازار میں ایک چھوٹی سی چائے کی دکان میں ٹیپ ریکارڈر یہ نغمہ بکھیر رہا تھا۔یار گل خانا یہ کیا تم ہر وقت نغمے سنتا رہتا ہے، کبھی کوئی اور پیار محبت والا گیت بھی لگا لیا کرو۔ پرویز لالہ نے گل خان کو مسلسل ملی نغمے سنتے دیکھ کر کہا۔لالہ تم تو جانتا ہے یار، مجھے اپنا وطن اور

پاک فوج سے کتنا محبت ہے۔اور میں جب بھی یہ نغمہ سنتا ہوں ماں تو یہ محبت اور بڑھ جاتا ہے۔گل خان نے جواب دیا۔اگر تجھے فوج سے اتنا ہی محبت ہے تو تم فوج میں کیوں نہیں گیا۔ پرویز لالہ نے گل خان سے پوچھا۔کیسا جاتا، لالہ تم تو جانتا ہے میرا باپ نے مجھے بچپن سے ہی کام پہ لگا دیا اور میں پڑھ نہ سکا۔لیکن لالہ قسم خدا کی، اگر کبھی میرا وطن یا فوج کو میری ضرورت پڑی تو سب سے آگے کھڑا نظر آؤں گا۔گل خان کے لہجے میں ایک عزم نظر آ رہا تھا۔لالہ میرا دل چاہتا تھا، سب دہشت گردوں کو چن چن کر مار دوں لیکن ہم کو پتا نہیں چلتا ہے، کون اپنا ہے اور کون دشمن۔ گل خان نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔گل خانا ہمارا فوج لڑ رہا ہے، ایک دن ضرور یہ دشمن یہاں سے دم دبا کر بھاگ جائے گا۔پرویز لالہ نے جواب دیا۔انشااللہ۔لالہ دو کپ چائے دینا۔۔کسی گا بک کی آواز آئی۔ٹیپ ریکارڈر اب بھی بج رہا تھا۔۔

ہر ایک دشمن کی سازشوں سے
یہ دیس ہم کو بچانا ہوگا
محبتوں کو فروغ دے کر
شعور ملت جگانا ہوگا
یہ کون ہیں جو ہمی میں رہ کر
ہمارے گھر کو جلا رہے ہیں
چلو یہ سوچیں ہم آج مل کر

ارے بھئی ناشتہ کہاں رہ گیا۔فلائٹ لیفٹیننٹ عمر نے آواز لگائی۔آ رہا ہے، صبر تو کریں۔ مسز عمر کا جواب آیا۔بیٹا آج بہو کو شام میں ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے، یاد ہے نا تمہیں۔عمر کی والدہ نے پوچھا۔جی امی جان، مجھے یاد ہے، میں وقت پہ گھر آ جاؤں گا۔آپ بھی تیار رہئے گا، آپ کی اپائنٹمنٹ بھی لے لی ہے میں نے۔عمر نے جواب دیا۔ارے بیٹا، مجھے کیا ہوا ہے، میں بالکل ٹھیک ہوں، اتنی دوائیاں نہیں کھائی جاتیں، مجھ سے۔عمر کی والدہ نے کہا۔لیجئے ناشتہ، مسز عمر

نے ناشتہ ٹیبل پر لگاتے ہوئے کہا۔امی جان آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک نہیں رہتی ہے، دوا نہیں کھائیں گی تو ٹھیک کیسے ہوں گی اور پھر آپ نے اپنے آنے والے پوتے یا پوتی کے بھی تو لاڈ اٹھانے ہیں نا۔عمر نے والدہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ جی امی،عمر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔مسز عمر نے بھی تائید کی۔اچھا بیٹا، لے چلنا مجھے بھی۔عمر کی والدہ نے ہار مانتے ہوئے کہا۔عرشی آ بھی جا، کالج سے دیر ہو جائے گی تمہیں۔مسز عمر نے اپنی نند کو آواز دی۔ بھابھی لیجئے میں آ گئی۔عرشی نے کرسی پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔کیسی چل رہی ہے تمہاری پڑھائی،عرشی۔عمر نے پوچھا۔ بھائی بہت اچھی چل رہی ہے بلکہ دوڑ رہی ہے۔عرشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ دیٹس گڈ۔اوکے، میں چلتا ہوں امی جان۔عمر نے اپنی والدہ کے سامنے جھک کر پیار اور دعا لیتے ہوئے کہا۔ بھائی مجھے کچھ کتابیں لینی ہیں اور اگلے ہفتے کالج میں ایک تقریب ہے جس کے لئے مجھے ڈریس لینا ہے اور کچھ خریداری کرنی ہے۔عرشی نے عمر کو روکتے ہوئے کہا۔عرشی ابھی پچھلے دنوں جو تم اتنی شاپنگ کر کے آئی ہو، اب دوبارہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔عرشی کی والدہ نے منع کیا۔کوئی بات نہیں امی جان کرنے دیں۔اوکے گڑیا، آج تو نہیں، ہم کل چلیں گے۔عمر نے پیار سے عرشی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔اوکے بھائی، یو آر دا بیسٹ۔عرشی نے خوشی سے کہا۔اوکے، میں اب چلتا ہوں۔ٹھیک ہے بیٹا، اللہ تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔عمر کی والدہ نے بیٹے کو دعاؤں میں رخصت کرتے ہوئے کہا۔۔۔

السلام علیکم سر! فلائیٹ لیفٹیننٹ عمر نے اندر داخل ہوتے ہوئے سکاڈرن لیڈر اسد کو سلام کیا۔وعلیکم السلام! آ بھئی، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔اسد نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ چلیں سر نائم ہو گیا ہے۔ میں نے بک آؤٹ کر دیا ہے۔عمر نے کہا۔ہاں چلو،اسد نے اٹھتے ہوئے کہا۔اور یار گھر میں سب خیریت ہے۔اسد نے جہاز کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔یس سر الحمدللہ سب ٹھیک ہے۔آپ بتائیں سر، بھابھی اور بچے ٹھیک ہیں؟ عمر نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ہاں، اللہ کا شکر ہے۔اسد نے جواب دیا اور سامنے کھڑے ایئر مین بابر کی طرف متوجہ ہو

گیا۔ بابر، تمہاری والدہ کی طبیعت کیسی ہے، اب؟ سر، اب اللہ کے فضل اور آپ سب کی دعاؤں سے کافی بہتر ہیں وہ۔ بابر نے جواب دیا۔ یہ تو اچھی بات ہے، خیال رکھنا ان کا۔ اسد نے بابر کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ سر ایک اچھی خبر ہے، شیر خان کی منگنی ہوگئی ہے اور صبح سے یہ لڑکیوں کی طرح شرماتا ہوا ادھر ادھر چھپ رہا ہے۔ بابر نے شیر خان کو آتا دیکھ کر کہا۔ بابر کے انداز اور شیر خان کے شرمانے پر عمر اور اسد کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ یہ تو اچھی خبر ہے شیر خان، بہت بہت مبارک ہو۔ اسد نے شیر خان کو مبارک باد دی۔ شیر خان یار، اس بات پر مٹھائی تو بنتی ہے، کب کھلا رہے ہو۔ عمر نے کہا۔ سر جب آپ بولو، کھلا دوں گا۔ شیر خان نے جواب دیا۔ اوکے، پھر ہم مشن سے واپس آ کر تم سے مٹھائی کھائیں گے۔ اسد نے کہا اور جہاز کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں دونوں پائیلٹس اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے ٹیک آف کے لئے پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔

ہدایات ملتے ہی جہاز ٹیکسی کرتا ہوا، رن وے کی طرف بڑھا اور پھر کچھ ہی لمحوں میں فضا میں بلند ہو گیا۔ یہ ایک معمول کا تربیتی مشن تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ جہاز مشن ایریا میں اپنا کام کرنے کے بعد اب واپس آ رہا تھا کہ اچانک پاور کم محسوس ہونے لگی۔ دونوں پائیلٹس نے فوراً کنٹرول ٹاور کو اطلاع دی اور ہنگامی اقدامات شروع کر دیئے۔ پاور بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔

پائیلٹس نے ایمرجنسی لینڈنگ کی کوشش کی لیکن اچانک پاور بالکل ختم ہوگئی۔ جہاز کا انجن بند ہو چکا تھا اور جہاز نیچے کی طرف گرنے لگا۔

وی لوسٹ دا کنٹرول،

وی لوسٹ دا کنٹرول۔

اسد نے کنٹرول ٹاور کو اطلاع دی۔ جلد ہی انہیں ایجیکٹ کر جانے کی ہدایت مل چکی تھی۔ سر! نیچے آبادی ہے۔ سکواڈرن لیڈر اسد کو فلائیٹ لیفٹیننٹ عمر کے چلانے کی آواز آئی۔ جہاز کا فاصلہ زمین سے لحہ بہ لحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں ہوا باز، موت یا زندگی کسی ایک کو چننے جا رہے

تھے۔ زندگی جس میں ان کے خوبصورت رشتے ان کا انتظار کر رہے تھے۔جس میں بہت سی خوشیاں ان کی منتظر تھیں۔ وہ زندگی جس میں مناہل کے بابا کو اس سے کیا وعدہ نبھانا تھا۔ وہ زندگی جہاں ایک بیٹا اپنی ماں اور بہن کا واحد سہارا ہے۔ وہ زندگی جس میں ابھی ایک باپ کو اپنے آنے والے بچے کو بانہوں میں لینا تھا۔ وہ زندگی جس میں ارسلان کے بابا کو اسے اپنی طرح اس دھرتی کے محافظ کی وردی پہنے دیکھنا تھا۔ وہ زندگی جسے وہ بھی جینا چاہتے تھے۔۔ دوسری طرف موت۔۔۔لیکن وہ موت جس میں بہت سے لوگوں کی زندگی کی نوید تھی۔ وہ موت جس میں بہت سے گھروں کی خوشیاں باقی رہنی تھیں۔ وہ موت جس میں شاید مناہل جیسی کئی بیٹیوں کے بابا کی زندگی چھپی تھی۔ وہ موت جسے شہادت کہا جاتا ہے۔شہادت جس کی تمنا اس دھرتی کا ہر سپاہی کرتا ہے۔

لمحوں کی بات تھی۔ فیصلہ ہو چکا تھا۔ زندگی یا موت ایک کو چنا جا چکا تھا۔۔عمر ایجیکٹ۔عمر ایجیکٹ۔اسد نے فلائیٹ لیفٹیننٹ عمر کو ہدایت تو دی لیکن خود اس کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ جہاز نیچے موجود بازار پر نہ گرنے پائے۔سر نیچے بازار ہے۔عمر کے جملے کا مطلب سکاڈرن لیڈر اسد اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ خالی میدان ہے، میں جہاز کا رخ اس کی طرف کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔اسد کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ چند ساعتوں کی بات تھی، زندگی موت کی سرحد پار کرنے جا رہی تھی۔ پاک فضائیہ کے دونوں محافظ جانتے تھے کہ اب ایجیکٹ نہ کیا تو بہت دیر ہو جائے گی لیکن اپنی زندگی، اپنے پیارے، اپنی بوڑھی ماں اور معصوم بچے کوئی بھی تو یاد نہیں تھا۔ کچھ یاد تھا تو صرف یہ کہ جہاز بازار پہ نہ گرنے پائے۔کسی کا بیٹا، باپ، ماں، بہن، بھائی کوئی پیارا ان سے نہ چھنے۔دونوں کی زبان پر کلمہ جاری تھا۔آنکھوں کی چمک بڑھ چکی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اگلے ہی لمحے کیا ہونے والا ہے۔لیکن ان کی جرأت موت کو بھی حیران کئے دے رہی تھی۔ چند سیکنڈ۔صرف چند سیکنڈ۔۔بابا پرامس کریں، کل آئیں گے میرے سکول۔۔ بھائی کل شاپنگ کے لئے جانا ہے۔۔آج کب آئیں گے آپ۔۔بیٹا بہو کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا آج۔۔بابا میرے لئے

پلین لے کر آنا۔۔ ماں میں وقت پر آجاؤں گا آج۔ واپس آ کر تم سے مٹھائی کھائیں گے۔۔۔۔۔جہاز کا رخ خالی میدان کی طرف ہو چکا تھا۔۔ چند سیکنڈز اور۔۔زندگی موت سے جا ملی ،زندہ جاوید ہونے کے لئے۔ زمین سے فاصلہ بہت کم رہ جانے کی وجہ سے دونوں ہوا باز ایجیکٹ نہ کر سکے لیکن اپنی زندگی کے چراغ گل کر کے بہت سی زندگیوں میں روشنی بھر گئے۔ بازار میں گل خان کا ٹیپ ریکاڈر آج بھی بج رہا تھا۔

چلے جو ہو گے شہادت کا جام پی کر تم
رسول پاک ﷺ نے بانہوں میں لے لیا ہوگا
علی تمہاری شہادت پہ جھومتے ہوں گے
حسین پاک نے ارشاد یہ کیا ہوگا
تمہیں خدا کی رضا میں سلام کہتی ہیں

*****

ضرب عضب کے اولین شہداء

لیفٹیننٹ کرنل عارف محمود

.....◆◆◆.....

شمالی وزیرستان میں دہشت گردوں نے مجاہدین ضرب عضب کے خلاف اپنے ناپاک منصوبے تیار کئے ہوئے تھے۔ خودکار بارودی سرنگوں اور آئی ای ڈیز کا جال بچھا کر دہشت گردوں کے ٹھکانوں تک پہنچنے والے تمام راستوں پر موت کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ دہشت گرد جانتے تھے کہ اب کی بار کفن بردوش آنے والی سپاہ ان کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے آرہی تھی۔ حکومت پاکستان اور عسکری قیادت بھی ان کی شاطرانہ چالوں اور مذاکرات کے نام پر زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کرنے کے حیلوں بہانوں سے واقف ہو چکی تھی۔ ماضی میں بھی دہشت گردوں کے فریب کا پردہ متعدد بار چاک ہو چکا تھا اور جنوبی وزیرستان میں سیکیورٹی فورسز کو آپریشن کرنا پڑا تھا۔ 2001 سے 2009 تک جنوبی وزیرستان، فاٹا اور سوات میں 177 بڑے اور 266 چھوٹے آپریشن کئے جا چکے تھے۔ ان آپریشنز میں سیکیورٹی فورسز کے 1457 افراد نے جام شہادت نوش کیا تھا اور 3459 زخمی ہوئے جن میں کچھ لوگوں کے اعضا بھی ضائع ہوئے تھے۔ 2009 میں بھی دہشت گردوں کی سرکوبی کا سلسلہ جاری رہا اور سوات میں پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم اور کامیاب ترین آپریشن راہِ راست عمل میں آیا، جس کے فوراً بعد جنوبی وزیرستان میں آپریشن راہِ نجات نے بھی کامیابی کا ایسا ہی معیار حاصل کیا تھا۔ 2014 کے آغاز سے ہی کالعدم تحریک طالبان پاکستان کے دہشت گردوں نے امن مذاکرات

کی آڑ میں معصوم پاکستانیوں کے قتل وغارت گری کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔

29 جنوری 2014 سے لے کر 8 جون 2014 تک وطنِ عزیز کے طول وعرض میں دہشت گردی کے 20 بڑے واقعات رونما ہوئے جن میں 192 معصوم شہری لقمہ اجل بنے۔ دہشت گردی کے ان حملوں کی منصوبہ بندی، تیاری اور تربیت و رسد کا مرکز شمالی وزیرستان تھا۔ جب بھی دہشت گردی کا کوئی بڑا واقعہ رونما ہوتا تو اس کے ڈانڈے وہیں جا کر ملتے تھے۔ میڈیا کی ترقی اور جدید ترین تکنیکی ذرائع معلومات نے پوری قوم کو اِس صورتِ حال سے آگاہ رکھنے میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا، حتیٰ کہ سیاسی قیادت سمیت پوری قوم کی ایک مضبوط اور پراعتماد سوچ نے جنم لیا تھا۔ آپریشن ضربِ عضب، پوری قوم کی ایک مشترکہ آواز اور دہشت گردوں کا قلع قمع کرنے کا عزم صمیم بن کر منظرِ عام پر آیا۔ قومی قیادت کی بھرپور حوصلہ افزائی اور عوام کے پرجوش اظہارِ یک جہتی کے ساتھ پاک فوج، پاک فضائیہ، فرنٹیئر کور، خاصہ دار فورس، لیویز فورس، خفیہ اداروں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں نے مشترکہ طور پر آپریشن ضربِ عضب کا آغاز کیا۔ اِس آپریشن کے مقاصد میں جہاں حکومتی عملداری کی بحالی تھا، وہیں شمالی وزیرستان سے دہشت گردوں کے خفیہ ٹھکانوں، بموں کی فیکٹریوں، اسلحہ خانوں اور تربیت گاہوں کی تباہی وبیخ کنی بھی تھا۔

حکومتِ پاکستان کی ہدایت پر آپریشن ضربِ عضب کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ 14/15 جون 2014 کی رات، افواجِ پاکستان نے فضائی حملوں کے ذریعے شمالی وزیرستان میں 8 خفیہ ٹھکانے تباہ کر دیئے تھے اور 105 دہشت گرد مارے جا چکے تھے۔ شمالی وزیرستان کے گرد حصار تنگ کرنے کے لئے نہ صرف ہمسایہ ایجنسیوں میں سپاہ کو تعینات کر دیا گیا تھا بلکہ افغانستان کی سیکیورٹی فورسز کو بھی درخواست کی گئی کہ افغان نیشنل آرمی اور افغان بارڈر پولیس کے ذریعے افغانستان سرحد کو مکمل طور پر بند کر دیا جائے اور فوری طور پر کنڑ، نورستان اور افغانستان کے دیگر علاقوں سے کالعدم تحریک طالبان پاکستان کے گڑھ ختم کئے جائیں۔ 15 جون کی صبح بھی جیٹ

طیاروں کی بمباری جاری رہی اور دیگان اور دتہ خیل میں موجود خفیہ ٹھکانوں کو نشانہ بنایا گیا۔

یہ آپریشن چونکہ صرف بلاامتیاز رنگ ونسل اور قوم، ملکی وغیر ملکی دہشت گردوں کی سرکوبی کے لئے کیا جا رہا تھا، اس لئے شمالی وزیرستان کے غیور اور بہادر قبائل نے بھی افواجِ پاکستان کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ 15 جون کی صبح شوال (شمالی وزیرستان) میں جیٹ طیاروں کی بمباری سے 5 خفیہ ٹھکانے تباہ ہوئے جبکہ 27 دہشت گرد جہنم واصل ہوئے۔

زمینی کارروائی کے لئے جو ہراول دستے علاقے میں تعینات ڈویژن اور ہیڈکوارٹر ٹوچی سکاؤٹس کے قرعہ انتخاب میں آئے، ان میں 5 ونگ ٹوچی سکاؤٹس اور 109 انجینئر بٹالین کی یونٹس بھی شامل تھیں۔ زمینی آپریشن میں ہراول دستے کا کردار ادا کرنے والوں نے، پیچھے آنے والی سپاہ کے لئے قدم قدم پر بچھی موت کو ہٹانا تھا تاکہ دشمن کی بیخ کنی کے اصل مقصد کو پورا کیا جا سکے۔ ایسے وقت میں انھیں اس بات کا مکمل ادراک ہونا تو یقینی تھا کہ جا بجا موت ان کی منتظر ہوگی، اب کہاں کہاں ان کی مہارت موت کو مات دے جائے گی اور کہاں شہادت کا جام ان کا منتظر ہو گا، یہ علم صرف داعیِ اجل کو ہی تھا۔ البتہ یہ طے تھا کہ ان کا ہر قدم موت کو گلے لگانے کے بھرپور شعور وادراک سے اٹھ رہا تھا۔

15 اور 16 جون کی رات 5 ونگ ٹوچی سکاؤٹس کو علی الصبح ایک مشن پر روانگی کے لئے ہراول دستے کا کردار ادا کرنے کے احکامات موصول ہو چکے تھے۔

ونگ کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل زاہد محمود اعوان نے رات کے پچھلے پہر اپنے ونگ ہیڈکوارٹر میں اپنے زیرکمان ساتھیوں کو جمع کیا اور ایک جامع منصوبہ ترتیب دیا۔ کانوائے کے ہراول دستے کے طور پر جس کیوآر ایف (سرعت رفتار گاڑی اور دستہ) کا انتخاب کیا گیا، اس کی قیادت لیفٹیننٹ وقاص کو سونپی گئی۔ اس دستے کے ہمراہ سرچ گروپ اور بم ڈسپوزل پارٹی بھی تھی۔ ان کا کام بارودی سرنگوں، آئی ای ڈیز یا کسی بھی قسم کے بارودی مواد کی شکل میں قدم قدم پہ بچھی موت کو تلاش کر کے ہٹانا اور اپنی سپاہ کو محفوظ راستہ مہیا کرنا تھا۔ اس دستے کے انتخاب میں ونگ کمانڈر

نے لیفٹیننٹ وقاص کی نیابت کے لئے اپنے بہادر اور ہمیشہ اگلی صف میں رہنے والے پیشہ ورانہ مہارت سے سرشار نائب صوبیدار عالمگیر وزیر کو بم ڈسپوزل اور سرچ گروپ کا انچارج بنایا۔انہیں روانہ کرتے ہوئے ونگ کمانڈر بولے،عالمگیر صاحب! آپ ایک منجھے ہوئے جے سی او ہیں اور کام کی حساسیت کے ساتھ ساتھ علاقے سے بھی واقف ہیں اور یہ اہم ذمہ داری میں آپ کے سپرد کر رہا ہوں تا کہ باقی سپاہ کے لئے راستہ محفوظ ہو۔اس پر عالمگیر صاحب نے اپنے پر اعتماد چہرے اور لہجے میں کہا تھا سر! عالمگیر نے پہلے کبھی شکایت کا موقع دیا ہے؟

نائب صوبیدار عالمگیر کی پارٹی میں 109 انجینئر بٹالین کے قابل فخر نمائندے نائیک حافظ امان اللہ اوران کے دو فیلڈ انجینئر ساتھی سیپر بشیر احمد عباسی اور سیپر عمران علی سجاد بھی موجود تھے۔ اس گروپ کا کام جہاں نفسیاتی طور پر اعصاب شکن اور انسانی عزم وجرأت کا امتحان تھا وہیں دشوار گزار اور سنگلاخ پہاڑوں کی وجہ سے نقل وحرکت میں بھی شدید مشکلات حائل تھیں۔کانوائے کی رفتار بہت کم تھی۔انجینئرز پیدل چلتے ہوئے اپنے مائین ڈیٹیکٹرز کی مدد سے راستے اور دونوں اطراف کے ایک ایک انچ کا معائنہ کرتے اور جونہی کسی بارودی سرنگ کا سراغ ملتا،انتہائی احتیاط اور مہارت سے اسے ناکارہ بنا کر راستہ محفوظ بنا دیتے۔کانوائے نے ونگ ہیڈکوارٹر غلام خان سے روانہ ہو کر تقریباً ایک گھنٹے تک کی مسافت طے کرنا تھی اور اپنی اپنی پوزیشن پر سامان رسد،افرادی قوت اور اسلحہ وبارود وغیرہ کی ترسیل یقینی بنانا تھی۔لیفٹیننٹ کرنل زاہد کے دل میں ایک عجیب سی بے چینی تھی،اگرچہ ان کا اپنے ہیڈکوارٹر میں موجود رہنا ضروری تھا لیکن آپریشن کی اہمیت کے پیش نظر انھوں نے کچھ اہم امور اپنے زیر کمان آفیسرز تک خود پہنچانے اور زمینی نشانات کے ساتھ وضاحت کرنے کا فیصلہ کیا اور خود بھی روانہ ہو گئے۔تمام سپاہ اور سامان حرب ورسد کے اپنی اپنی جگہ صحیح سلامت پہنچنے کے بعد انہوں نے انتہائی سرعت سے خود موقع پر پہنچ کر معائنہ کیا اور ڈویژن ہیڈکوارٹر اور ہیڈکوارٹر ٹوچی سکاؤٹس سے موصولہ ہدایات کی روشنی میں احکامات جاری کر کے واپس روانہ ہو گئے۔نائب صوبیدار عالمگیر کی پارٹی اب سرخرو تھی کہ پورا کانوائے صحیح وسلامت

اپنی منزل مقصود پر پہنچا دیا گیا تھا۔ واپسی کا سفر شروع ہوا تو بظاہر خطرے کی کوئی وجہ موجود نہ تھی، یہ وہی راستہ تھا جس پر صبح کے وقت کانوائے گزر کر گیا تھا۔ تمام اہم جگہوں پر اپنی پکٹس بنا کر ٹریک پر نظر رکھنے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا، لیکن سفاک اور شاطر دشمن نے اپنی جدید ترین تربیتی مہارت اور پاکستان دشمن ممالک سے حاصل شدہ ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے کوئی ایسی آئی ای ڈی بھی نصب کر رکھی تھی، جس میں دھات سے زیادہ لکڑی کا استعمال ہوا تھا اور اس کے طریقہ نصب اور خصوصی بناوٹ کی وجہ سے روایتی آلات سے اس کی شناخت نہ ہو پائی تھی۔ ریموٹ کنٹرول چلانے والا دہشت گرد کسی گہری کھائی، پہاڑی نالے اور چٹان کی آڑ میں صبح سے موقعے کی تلاش میں تھا۔ سب کو موت کے منہ سے چھین کر بحفاظت منزل پہ پہنچانے والے نائب صوبیدار عالمگیر اور ان کے سر بکف ساتھی اب اپنی گاڑی پہ سوار واپس رواں دواں تھے۔ ایک چشم دید گواہ نے بتایا کہ بموں اور گولوں کو ناکارہ بنانے کی کارروائی کے دوران جب دیکھنے والوں کی سانسیں اٹکی ہوتیں تو پاک فوج کے یہ نڈر سپاہی، کمال بہادری اور دلیری سے موت کے ان پروانوں کو کھلونوں کی طرح ہینڈل کر رہے ہوتے۔ سب کا مورال بلند تھا۔ جبکہ کانوائے کو نقصان پہنچانے سے ناکامی کے بعد صبح سے منتظر دہشت گرد نے مایوس ہو کر آخر میں واپس آتی ہوئی گاڑی کو ہی غنیمت جانا اور جوں ہی یہ گاڑی بارودی سرنگ کے اوپر پہنچی تو اس نے ریموٹ کا بٹن دبا دیا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔

ہراول دستہ میں شامل 6 ونگ ٹوچی سکاؤٹس کے 4 جان نثاروں کے ساتھ ساتھ انجینئرز کے 2 سیپرز نے اپنی جاں جانِ آفریں کے سپرد کر کے آپریشن ضربِ عضب کی پہلی صبح اپنے خون سے سجا دی تھی۔ اس طرح خیبر پختونخوا کی سرزمین کے عظیم بیٹے، نائب صوبیدار عالمگیر آپریشن ضربِ عضب کے اولین شہیدوں کی صف میں سرفہرست درج ہوئے۔

نائب صوبیدار عالمگیر 5 دسمبر 1995 کو ایف سی میں شمولیت اختیار کر کے پاکستان کی بہادر سپاہ کا حصہ بنے تھے۔ ان کی فرنٹیئر کور میں شمولیت پر ان کی پوری برادری میں اور خاندان

میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ۔شہیدا پنے لواحقین میں اہلیہ اول زادبی بی، دو بیٹے شبیر خان، صاحب خان اور بیٹیاں روخان بی بی اور فر خان بی بی چھوڑ گئے ۔وہ چار بہن بھائیوں میں اول نمبر پر تھے ۔ وہ یکم جنوری 2009 سے بحیثیت نائب صوبیدار 5 ونگ ٹوچی سکاؤٹس میں فرائض انجام دے رہے تھے ۔نائب صوبیدار عالمگیر ایک اچھے تربیت یافتہ جے سی او، بہادر، جرأت مند، جفاکش، بلند حوصلہ اور محنتی انسان تھے اور گزشتہ 18 سال 5 مہینے 11 دن سے شہادت کے اس عظیم رتبے کے لئے تیار، اپنی خدمات احسن ترین انداز میں انجام دے رہے تھے ۔نائب صوبیدار عالمگیر نے اپنے خاندان اور ملک وقوم کے ساتھ ساتھ 5 ونگ ٹوچی سکاؤٹس کا سر فخر سے بلند کر دیا۔قوم کو اپنے اس جوان پر ازحد فخر ہے کہ اس نے اپنی جان نچھاور کر کے وطن کا پرچم بلند رکھا۔شہید کی نماز جنازہ ان کے آبائی گاؤں زندا علی خیل تحصیل وضلع بنوں میں ادا کی گئی ۔جس میں عوامی، سیاسی اور مذہبی شخصیات نے شرکت کی ۔

شہداء کے اس اولین دستے کے دوسرے شہ سوار لانس نائیک زاہد حسین طوری کا تعلق پارہ چنار کرم ایجنسی کے ایک گاؤں بغدی سے تھا۔لانس نائیک زاہد حسین اپنے 5 بہن بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھے ۔انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں بغدی سے حاصل کی اور مڈل پاس کرنے کے بعد 20 ستمبر 2006 کو فرنٹیئر کور کی بہادر سپاہ میں شامل ہوئے تھے ۔زاہد حسین گزشتہ 7 سال 9 مہینے اور 28 دن سے 6 ونگ ٹوچی سکاؤٹس کی برادری کا حصہ تھے ۔لانس نائیک زاہد حسین ایک اچھے تربیت یافتہ سپاہی، جفاکش سولجر، بلند حوصلہ اور محنتی انسان تھے ۔انھوں نے شہادت کا بلند مرتبہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرائض انجام دیتے ہوئے حاصل کیا۔شہید کی نماز جنازہ ان کے آبائی گاؤں بغدی پارہ چنار کرم ایجنسی میں پڑھی گئی جس میں عوامی، مذہبی اور سیاسی شخصیات نے شرکت کی ۔انہوں نے اپنے لواحقین میں اہلیہ صابرہ کے علاوہ دو بیٹے اقرار حسین اور ثقلین عباس چھوڑے ۔

اس قافلے کے مرکزی کردار اس گاڑی کے ڈرائیور سپاہی نذر گل بھٹنی تھے، جن کا تعلق ضلع

تانک کے گاؤں لکی مچن خیل سے تھا۔سپاہی نذر گل اپنے 4 بہن بھائیوں میں پہلے نمبر پر تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں لکی مچن خیل سے حاصل کی اور مڈل پاس کرنے کے بعد فرنٹیئر کور کے 5 ونگ ٹوچی سکاؤٹس میں شامل ہوگئے۔ایم ٹی سپاہی نذر گل 5 ونگ ٹوچی سکاؤٹس میں 5 سال 2 مہینے اور 14 دن تک قابل فخر خدمات انجام دیں اور بال آخر اپنی جان وطن پر نچھاور کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی دھرتی، اپنے خاندان اور اپنے ونگ کا فخر بن گئے۔انہوں نے اپنے لواحقین میں اہلیہ شاہ بیگم، 3 بیٹیاں اور ایک بیٹا چھوڑا ہے۔

چوتھے شہید 5 ونگ کی اپنی انجینئر پلاٹون (پائنیر پلاٹون) کے چاق چوبند سپاہی افسر علی یوسفزئی کا تعلق ضلع مردان کے گاؤں شموزئی سے تھا۔انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں سے حاصل کی تھی اور میٹرک پاس کرنے کے بعد فرنٹیئر کور کی بہادر سپاہ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ سپاہی افسر علی گزشتہ 7 سال 8 ماہ اور 15 دن سے اس ونگ کا حصہ تھے۔وہ اپنے 5 بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھے۔ابھی چند ہی سال پہلے 10 مارچ 2009 کو انھیں شادی کے بندھن میں باندھا گیا تھا۔شہادت کے بعد ان کی دلہن کائنات اب شہید کی اہلیہ بن چکی ہیں۔

اس گاڑی میں سوار بارودی سرنگوں اور آئی ای ڈی سے نمٹنے کی تکنیکی مہارت رکھنے والوں میں 109 انجینئر بٹالین کے نائیک حافظ امان اللہ بم ناکارہ بنانے کے ماہر تھے۔ان کے ہمراہ پارٹی میں ان کے دو فیلڈ انجینئر ساتھی سیپر بشیر احمد اور سیپر عمران علی سجاد بھی تھے۔انہیں 15 جون 2014 کو 5 ونگ ٹوچی سکاؤٹس کے کانوائے کے ساتھ بم ڈسپوزل پارٹی کا کمانڈر تعینات کیا گیا تھا۔علی الصبح بم ڈسپوزل پارٹی اپنی سپاہ کے راستے کی رکاوٹیں ہٹانے نکلی اور بغیر کسی خوف اور ڈر کے، بے دھڑک راستے میں پھیلی موت کو چنتے چنتے اور اپنے ساتھیوں کے لئے راستے کو محفوظ بناتے ہوئے، آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔وہ جانتے تھے کہ چالاک اور بے رحم دشمن نے جگہ جگہ بارودی سرنگیں لگا رکھی تھیں اور یہ کام انتہائی خطرناک تھا جس میں ہر لحظہ جان کا خطرہ لاحق تھا۔مگر پاک فوج کے یہ جوان جان ہتھیلی پہ رکھے راستے کی رکاوٹیں ہٹاتے چلے گئے۔اس انتہائی

اعصاب شکن اور خون منجمد کرنے والے کام میں کسی بھی لمحے ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی تھی، حتیٰ کہ وہ کامیابی سے بنائی گئی منزل پر جا پہنچے۔ جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک انجام پا گیا تو اس پارٹی کی واپسی کا آغاز ہوا تھا اور گیارہ بج کر چالیس منٹ پر جب دھماکہ ہوا تو ٹوچی سکاؤٹس کے شہداء کے علاوہ نائیک حافظ امان اللہ اور ان کے ایک ساتھی سیپر بشیر احمد نے موقع پر ہی جام شہادت نوش کیا۔ ان کے تیسرے ساتھی سیپر عمران علی سجاد شدید زخمی ہو گئے۔ خیبر پختونخوا کی سرزمین کے عظیم بیٹے نائیک حافظ امان اللہ نے 21 اپریل 2003 کو آرمی میں شمولیت اختیار کی تھی۔ وہ اپنے پانچ بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھے۔

شہید نائیک حافظ امان اللہ نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں سے ہی حاصل کی تھی اور 13 اکتوبر 2008 سے 109 انجینئر بٹالین میں بطور فیلڈ انجینئر عسکری خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ انھوں نے پاکستان آرمی میں سروس کے دوران ایم اے اسلامیات کی ڈگری بھی حاصل کی تھی۔ ان کی فوج میں شمولیت پر ان کی پوری برادری اور خاندان میں ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ نائیک امان اللہ شہید جاتے جاتے اہل وطن کو فلسفہ حیات و ممات کے اسرار و رموز بتا گئے کہ جان جاتی ہے تو جائے، مگر وطن عزیز پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ نائیک حافظ امان اللہ نے 11 سال ایک مہینہ اور 25 دن تک نہایت ہی بہادری، جرأت، ایمانداری اور جذبۂ حب الوطنی کے ساتھ پاک فوج میں خدمات انجام دی تھیں اور بالآخر شہادت کا عظیم مرتبہ بھی حاصل کیا۔ شہید کی نماز جنازہ ان کے آبائی گاؤں موناخیل ضلع کرک میں پڑھی گئی جس میں عوامی، سیاسی اور مذہبی شخصیات نے شرکت کی۔ شہید اپنے لواحقین میں اہلیہ سنگترہ بی بی، تین بیٹے محمد عمر فاروق، محمد ابوبکر صدیق، محمد زکریا اور ایک بیٹی عائشہ صدیقہ چھوڑ گئے۔

سیپر بشیر احمد عباسی شہید کا تعلق ضلع ہری پور کے ایک گاؤں ہالی (بگلہ) سے تھا۔ سیپر بشیر احمد اپنے سات بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم آبائی گاؤں سے حاصل کی تھی اور میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد 28 اگست 2003 کو پاک فوج کی مایہ ناز

سپاہ انجینئر کور کا حصہ بنے تھے۔چند ماہ پہلے سیپر بشیر احمد 109 انجینئر بٹالین میں بطور ڈی ایم ٹی تعینات ہوئے تھے۔15 جون 2014 کے دن جب صبح صبح سیپر بشیر احمد اور ان کے دو ساتھیوں کو 5 ونگ ٹوچی سکاؤٹس کے ہمراہ بم ڈسپوزل پارٹی کے طور پر بھیجا گیا تو ان کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا کہ آپریشن ضرب عضب کا عملی حصہ ہونا تو باعث فخر تھا ہی، مستزاد یہ کہ وہ ہراول دستے میں ہونا اور قدم قدم پہ بچھی موت کو بار بار چیلنج کرنا کہ ''اے موت آج تو میرے وطن کے سجیلے جوانوں کا بال بیکا کر کے تو دیکھ، تو ہم سے آگے بڑھے گی تو ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی جا سکے گی۔'' اپنے کانوائے کو منزل پہ محفوظ پہنچانے کے بعد یہ پارٹی جب قدرے بے فکر اور مطمئن واپس جا رہی تھی تو بزدل اور شاطر دشمن نے چھپ کر وار کیا اور اس طرح انجینئرز کے یہ سر بکف جانثار آپریشن ضرب عضب کے اولین شہداء قرار پائے۔سیپر بشیر احمد شہید کی پاک فوج میں خدمات کا دورانیہ 10 سال 9 مہینے اور 8 دن تھا اور دو ہی سال پہلے بالکل اسی دن ان کی شادی ہوئی تھی، گویا ایک مجاہد نے اپنی شادی کی دوسری سالگرہ پر میدان کارزار سے اپنی نو بیاہتا دلہن کو اپنے لہو کا غازہ تحفتاً ارسال کیا تھا۔آج شہید کی اہلیہ رخسانہ بی بی اور ایک بیٹ مقدس بشیر بڑے فخر سے دنیا بھر کو بتا سکتی ہیں کہ ان کے پیارے نے اپنی بیٹ کو یتیم اور اہلیہ کو شہید کی اہلیہ تو بنا ڈالا لیکن اپنے وطن کی کروڑوں بہنوں بیٹیوں کے بھائی، باپ اور سہاگ اجڑنے سے بچا لئے تھے۔

*****

میرا بھائی۔میرا فخر

مہرین رانی

.....●●●.....

میں جب بھائی سے پوچھا کرتی کہ اتنے خطرناک علاقے میں آپ کو ڈر نہیں لگتا تو کہتے:
''ملک کے رکھوالے ڈرنے والے نہیں ہوتے۔ جب میں وردی پہن لیتا ہوں تو میرے اندر ایک عجیب سا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔دل چاہتا ہے ابھی جا کر دشمن سے ٹکرا جاؤں اور اسے جڑ سے اکھاڑ کے پھینک دوں۔'' ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ''پریشان نہ ہوا کرو،اچھا لباس پہنو،اچھا کھاؤ اور ملک کے لئے کچھ کر کے دکھاؤ۔اپنے اندر ہمیشہ کچھ کر کے دکھانے کا جذبہ رکھو۔جس سے دوسروں کو بھی فائدہ ہو۔'' بھائی جب کچھ لکھتا تو آخر میں اپنے نام کے ساتھ True Soldier ضرور لکھا کرتا تھا۔میرا بھائی میرا فخر ہے، پاکستان کا فخر ہے اور مجھے اپنے شہید بھائی پہ ہمیشہ فخر رہے گا۔

سیپر عمار شہید کو ہم سے بچھڑے ایک سال ہوگیا ہے۔وہ 12 اپریل 1987 کو چکوال کے ایک گاؤں صابہ جوہڑہ میں پیدا ہوئے۔ چکوال کے ہر خاندان کا کوئی نہ کوئی فرزند پاکستان آرمی میں ہے،اس حوالے سے یہ فوجیوں کے خطے کے طور پر مشہور ہے۔عمار نے ابتدائی تعلیم پاک ایسٹرن آئیڈیل اکیڈمی سے حاصل کی۔ پھر گورنمنٹ ہائی سکول ماہال مغلاں سے میٹرک کیا۔ کیمسٹری،فزکس اور ریاضی کے مضامین سے انہیں بہت دلچسپی تھی۔میٹرک کے بعد پاک آرمی میں ٹیسٹ دیا اور ساتھ ہی پوسٹ گریجویٹ کالج چکوال میں داخلہ لے لیا۔انہیں آرمی میں جانے

کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ جب بھائی کا کال لیٹر آیا تو پڑھائی چھوڑ کے آرمی جوائن کر لی۔ 15 دسمبر 2005 کو ان کا خواب پورا ہوا تو وہ بہت خوش تھا۔

عمار احمد نے اپنی سروس کا زیادہ تر حصہ آپریشن ایریا میں گزارا۔ انہوں نے جنوبی وزیرستان جنڈولہ سرارغہ اور شکئی میں زیادہ تر خدمات انجام دیں۔ کہتے ہیں کہ جس کی موت جس جگہ لکھی ہو، تقدیر اسے وہاں لے جاتی ہے۔ لہٰذا 30 جون 2012 کو لاہور سے انجینئرز بٹالین کی ایک فیلڈ کمپنی کے کچھ جوانوں کو میران شاہ شمالی وزیرستان بھیجا گیا جس میں عمار احمد بھی شامل تھے۔ یکم جولائی کو عمار سمیت تمام جوان میران شاہ پہنچ چکے تھے۔ عمار 5 بہنوں کا اکلوتا بھائی اور اپنے خاندان کا واحد وارث تھا۔ امی کی جان تھا۔ سب گھر والے اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ دادی انہیں چاند کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔ وہ جب میران شاہ سے گھر چھٹی گزارنے آئے تو بہت خوش اور مطمئن تھے۔ امی نے بتایا کہ ہمارے جاننے والے ہیں۔ ان کا ایک بیٹا کیپٹن حسنات شہید ہوا ہے۔ میں وہاں گئی تو اس کی امی اور بیوی بہت روتی تھیں۔ ان سے مل کر آئی تو تین دن تک سو نہ سکی۔ بھائی نے ایک دم سے کہا کہ "امی جان اگر میں شہید ہوا تو رونا مت۔"

عمار اپنے کمپیوٹر پر میجر عزیز بھٹی شہید پر بنایا گیا ڈرامہ دیکھتا رہتا۔ ایک موقع پر وہ کہتے ہیں کہ وردی اور کفن اپنا اپنا ہی اچھا لگتا ہے اور عمار نے بھی شہادت کی صبح نئی وردی پہنی تھی۔ بھائی کے رفقائے کار بتاتے ہیں کہ عمار کو شہادت سے بہت لگاؤ تھا۔ ہر صبح ڈیوٹی پہ جانے سے پہلے سب سے مل کر جاتا کہ نہ جانے کب موت کا بلاوا آ جائے۔ 30 مارچ کو عمار اپنے گھر والوں سے جدا ہو کر واپس میرانشاہ ڈیوٹی پر چلا گیا۔ میران شاہ آپریشن ایریا ہے اور بہت خطرناک بھی ہے۔ عمار کے ساتھی جب ان کو پیچھے رہنے کو کہتے تو وہ کہتا کہ قسم پریڈ پر میں نے وطنِ عزیز کی حفاظت کی قسم اٹھائی تھی۔ اب وہ وقت آ گیا ہے جب میں اپنا فرض نبھاؤں۔

آخرکار 15 اپریل کا دن آ گیا۔ ایک روز قبل ہی عمار کو بتا دیا گیا تھا کہ اسے صبح اپنی کمپنی کے ساتھ جانا ہے۔ صبح اٹھتے ہی عمار نے غسل کیا، نماز پڑھی، ناشتہ کرنے کے بعد یونیفارم پہنی۔

عمار نے اپنا سامان کمپنی کی گاڑی میں رکھا، سب دوستوں سے ہنسی خوشی ملا اور پھر گاڑی میں ہاتھ ہلاتے مسکراتے ہوئے چلا گیا۔ان کی کمپنی انجینئر کی پروٹیکشن کے لئے غلام خان گئی۔عمار کو جو جگہ بتائی گئی اس کو اچھی طرح سرچ کیا اور پھر کلیئر قرار دے کر کام شروع کرا دیا۔عمار چونکہ انجینئر ز میں تھے اور میران شاہ میں بم انسٹرکٹر تھے اس لئے اَن پھٹے بموں کو ناکارہ بھی بنایا کرتے تھے۔ 15 اپریل رات نو بج کر 39 منٹ پر عمار نے گھر پر کال کی۔وہ بہت خوش اور مطمئن تھا، کہنے لگا کچھ دنوں بعد یونٹ موو کرے گی تو میں واپس آ جاؤں گا۔ 15 اپریل کی شام کو ساڑھے بارہ بجے عمار اپنی پارٹی سمیت غلام خان سے واپس اپنی یونٹ آ رہا تھا کہ اچانک بارود سے بھری گاڑی ان کے قریب سے گزری۔ بھائی کو شک ہوا کہ نزدیک کہیں خطرہ ہے۔ بھائی نے ایک جوان کو آگے بھیجا کہ دیکھے گاڑیاں کیوں رکی ہوئی ہیں۔اس نے بتایا کہ آگے والی گاڑی میں کوئی خرابی ہے۔ تب وہ بارود سے بھری گاڑی واپس آئی اور اگلی گاڑی کے ساتھ جا ٹکرائی جس سے ایک زوردار دھماکہ ہوا، جس میں بہت سارے جوان موقع پر ہی شہید ہو گئے۔بارود کا ایک ٹکڑا عمار احمد کی گردن پر جا لگا جس کی وجہ سے عمار کی ناک اور منہ سے خون بہنے لگا۔ساتھی انہیں فیلڈ ہسپتال لے جانے لگے تو دھماکے کی جگہ سے شور اور چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔عمار نے کہا،'' میں ٹھیک ہوں، آپ باقی ساتھیوں کو سنبھالیں۔''

فرسٹ ایڈ کے بعد عمار کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے پشاور لے جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ہیلی پیڈ پر ہی عمار نے کلمہ پڑھا اور اللہ کی راہ میں جان قربان کر دی۔رات 8: 49 کا وقت تھا جب میرے موبائل پر میران شاہ سے کال آئی اور پتہ چلا کہ میرا بھائی شہید ہو گیا۔ 17 اپریل کو عمار احمد شہید کی میت کو گھر لے کر آئے تو پورے علاقے میں کہرام مچ گیا۔کیونکہ عمار نے ساری زندگی بہت اچھے کام کئے تھے جس کی وجہ سے علاقے کے لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ بھائی کی شہادت کے وقت ان کی جیب سے ایک ڈائری نکلی جس کے پہلے صفحے پر لکھا تھا،''ہم ہیں قوم کے بیٹے'' ایک اور ورق پر تحریر تھا:

ہم خود تراشتے ہیں منظر کے راہِ سنگ
ہم وہ نہیں کہ جنہیں زمانہ بنا گیا

*****

شہادت تیرا عنوان زندگی

سعدیہ ریاض راجہ

.....◆◆◆.....

مقام شہادت کسی انسان کا لکھا نہیں بلکہ یہ وہ رتبہ ہے جو ایک انسان ماں کے بطن میں حکم خداوندی سے پاتا ہے۔ دنیا میں آنے سے پہلے یہ لوگ جنت کے مکین رہ چکے ہوتے ہیں۔ آج دنیا میں آتے ہیں تو یہ عام انسان نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے بن جاتے ہیں۔ تبھی تو ان کا جینا اور مرنا عالم انسانیت کے لئے ایک لازوال مثال بن جاتا ہے اور وہ اپنی جرأت و بہادری سے لازوال تاریخ رقم کر جاتے ہیں۔ جس رتبے کے لئے بڑے بڑے عظیم لوگوں نے خواہش کی ہو مگر ملتا اسی کو ہے جس کی تقدیر میں اللہ رب العزت تحریر کر دے۔ میرا شہزادہ بہادر بھائی کیپٹن نجم ریاض راجہ شہید بھی اللہ تعالیٰ کے ان خاص بندوں میں شامل ہو کر شہادت کے اعلیٰ منصب پر ہمیشہ کے لئے فائز ہو گیا اور شہادت کا حقیقی اور سب سے بڑا میڈل اپنے سینے پر سجا گیا۔ نجم میرے پیارے بھائی، آج آپ سے بچھڑے ہوئے پانچ برس بیت گئے ہیں مگر ہر لمحہ ہر پل آپ ہمارے ساتھ ہیں کیونکہ شہید کبھی مرتا نہیں، بلکہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

شہادت تیرا عنوان زندگی اے نجم
شہادت ہی تیرا مقصدِ زندگی اے نجم

نجم ایک باکردار، نڈر، شجاع و بہادر اور مضبوط قوتِ ارادی کے مالک انسان تھے۔ جنہوں نے اپنے کردار اور گفتار سے مردِ مومن اور مردِ مسلمان ہونے کا ثبوت دیا۔ دشمن کے آگے جھکنا نہیں

بلکہ دشمن کو جھکانا سیکھا تھا اور اپنے تحریر کردہ شعر کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے، لازوال جرأت و بہادری کا مظاہرہ کیا اور شعر کو حقیقت میں بدل ڈالا۔

ہم وہ نہیں مصلحت کے نام پر جبہ و دستار بیچ دیں
ہم وہ جنگجو نہیں جو پیٹ کی خاطر دین و تلوار بیچ دیں

نجم میرا پیارا بھائی، اپنے والدین کا انتہائی فرمانبردار بیٹا، جس نے اپنے ماں باپ بھائی بہنوں کا سر فخر سے بلند کر ڈالا۔ ایک لائق، قابل ذہین بیٹا جس نے اپنے والدین کے سامنے کبھی اونچے لہجے میں بات تک نہ کی۔ والدین سے عزت و احترام کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ان کو تحفہ شہادت عطا فرمایا۔ اور وہ ہمیشہ کی زندگی پا گئے۔ نجم بہنوں اور بھائیوں سے بے پناہ پیار اور انتہائی عزت و احترام سے پیش آنے والے عظیم بھائی تھے۔ اپنے پیار و محبت اور عزت سے ہر کسی کا دل جیتا۔ میں صدقے اور قربان جاؤں اپنے بہادر بھائی پر۔ کیپٹن نجم ریاض راجہ شہید ایک نام ہے جرأت و بہادری کا، جو کہتے، وہ کر دکھاتے تھے۔ دنیا کی کسی چیز کا حرص نہ تھا۔ نہ مال و دولت اور نہ ہی شہرت کا۔ مگر جسے اللہ رب العزت دنیا اور آخرت کے بلند رتبوں پر فائز کرنا چاہے، انہیں ان دنیاوی لذتوں سے دور رکھتے ہیں۔ حقیقی اور ابدی عزت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو عطا کریں۔ نجم کے اندر غرور و تکبر نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کو غرور اور تکبر پسند نہیں ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کو نہ جانے میرے بھائی کی کون کون سی ادا پسند آئی جو میرے بھائی کے سر پر شہادت کا تاج سجا ڈالا۔

ہمیشہ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شیروں کی طرح بات کی۔ ساری دنیا کو بتا ڈالا کہ پاکستانی فوجی کبھی دشمن سے نہیں ڈرتے۔ چاہے نہتے ہی کیوں نہ ہوں اور دشمن چاہے بھاری اسلحے سے لیس ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے زور بازو سے آٹھ طالبان کی نہتے گردنیں توڑ کر دشمن کو بتا دیا کہ آپ ایک بہادر کمانڈو اور محب وطن پاکستانی ہو۔ دشمن کے مکروہ ارادوں کو ملیا میٹ کر ڈالا۔ ہمیں فخر ہے کہ آپ کی بہادری، آپ کی دلیری پر، آپ کے جذبے پر کہ بہادر ماں اور پاکستان

کے بیٹے آپ جیسے ہی ہوتے ہیں اور بہنوں کے مان ایسے شیر دلیر ہی ہوتے ہیں۔ مادر وطن سے محبت ہی تھی کہ جس کی خاطر آپ نے اپنی جان نچھاور کی۔ اپنے لہو کا قطرہ قطرہ اپنے وطن کے نام کیا۔ بہادر بیٹے ہی ماں کی آن اور شان ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے میرے بھائی نجم کی جو تین خواہشیں تھی، وہ پوری کر ڈالیں فوج میں شمولیت، ایس ایس جی کا حصہ بننا اور شہادت کی تمنا۔ یہ خواہشات پاکستان سے بے انتہا محبت کا اظہار تھیں۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کو تا قیامت سلامت رکھے۔ میرے شہید بھائی کا وطن جو انہیں اپنی جان سے بھی پیارا تھا۔

سوات میں تعیناتی کے دوران مجھے نجم کی وہ بات اب بھی یاد ہے جب نجم نے شہادت کی بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''میں شہید ہو جاؤں گا۔'' تو میں نے کہا کہ'' نجم آپ موت سے نہیں ڈرتے؟'' تو میرے شہزادے بھائی نے مسکرا کر کہا کہ ''میں موت سے نہیں ڈرتا۔'' مجھے اب بھی وہ مسکراتا ہوا چہرہ یاد ہے، جس کے چہرے پر موت کا خوف نہیں بلکہ شہادت کی خوشی تھی۔ ہمیں اپنے بھائی پر فخر ہے کہ جس نے حق اور سچ کا ساتھ دیا اور باطل کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا۔ باطل حق کو کبھی مات نہیں دے سکتا۔ اسے ہر حال میں حق کے آگے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ نجم نے نہ صرف ہمارا بلکہ ساری قوم کا سر فخر سے بلند کر ڈالا ہے۔ اللہ رب العزت آپ کی شہادت قبول فرمائے اور آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

*****

قضا سے پنجہ کش ہوا باز

لیفٹیننٹ کرنل عارف محمود

.....•••.....

فضا میں آگ کا گولہ،شعلوں میں لپٹا ہوا نائٹ سٹاکر ایم۔آئی سترہ نواپاس (باجوڑ ایجنسی) سے خارکی طرف غیر معمولی رفتار سے شہاب ثاقب کی طرح بڑھ رہا تھا۔غلاف مہیا کرنے والے ہیل 412 اور کوبرا ہیلی کاپٹر کے پائلٹ حیران تھے کہ ایم آئی 17 نے خلاف معمول بغیر بتائے یکدم ٹیک آف کرلیا تھا۔ہیل 412 کے پائلٹ میجر فیصل پراچہ نائٹ سٹاکر تھری کو بار بار پکار رہے تھے لیکن جواب نہیں آرہا تھا۔کوبرا کے پائلٹ میجر معظم بھی کوشش کر چکے تھے مگر ایم آئی 17 کے کیپٹن آف دی ائیر کرافٹ میجر محمد ہمایوں جہانزیب کی آواز انھیں سنائی نہیں دے رہی تھی۔ان کے ریڈیو میں شاید پہلے ہی کوئی فنی خرابی آچکی تھی۔دونوں پائلٹ ایم آئی 17 کو بتانا چاہتے تھے کہ ان کے ہیلی کاپٹر کی رفتار انتہائی تیز تھی۔

یہ پرواز اس رسد کا حصہ تھی جس کا آغاز 24 اکتوبر 2009 کی صبح اس وقت ہوا جب پاک افغان سرحد (ڈیورنڈ لائن) پر نواپاس کے مقام پر تعینات ایف سی کے جوانوں کے لئے سامان رسد اور ایمونیشن کی سخت کمی کا سامنا تھا اور کئی روز سے خرابِ موسم کی وجہ سے رسد کی کوئی پرواز آگے نہیں بھیجی جاسکی تھی۔دہشت گردوں کی مسلسل ہٹ دھرمی اور یکے بعد دیگرے اشتعال انگیز کارروائیوں نے حکومت کو مجبور کر دیا تھا کہ آپریشن کی راہ اختیار کی جائے۔چنانچہ جوابی کارروائی میں پاک فوج کا آپریشن راہ نجات جاری تھا۔

باجوڑ ایجنسی میں پاک افغان سرحد کے قریب بڑی سطح پر آپریشنز کی ذمہ داری پشاور کور کی

تھی ۔ پشاور کور نے مختلف مقامات پر ہنگامی طور پر اپنی سپاہ کے لئے سامان حرب وضرب اوراشیائے خوردونوش کے لئے پاکستان ایوی ایشن کی خدمات حاصل کررکھی تھیں ۔با جوڑ سکاؤٹس کے قلعہ خار سے سامان رسد ہیلی کاپٹر پر لاد کر عین پاک افغان سرحد پر نواپاس کے مقام پر ذخیرہ کرنا تھا ۔گرچہ ارباب اختیار کو اس مقام کی حساسیت کا ادراک تھا لیکن خطرات کی پرواہ نہ کرنا اور اپنے وطن کی حفاظت کے لئے سر پر کفن باندھ کر آتش نمرود میں کود جانا ہی پاک فوج کا طرہ امتیاز ہے۔ چنانچہ یہ ذمہ داری پاکستان آرمی ایوی ایشن کے مایہ ناز سکارڈن 'نائٹ سٹاکرز' کے حصے میں آئی تھی ۔

نائٹ سٹاکرز کے ایم آئی سترہ پر کیپٹن آف دی ائیر کرافٹ کے فرائض ہوابازمیجر ہمایوں جہانزیب انجام دے رہے تھے جبکہ معاون ہوباز کے طور پر نوجوان ہوباز کیپٹن ذیشان ان کے دست راست تھے ۔صبح سے اب تک رسد کی تین اڑانیں حساس اور خطرناک علاقے میں پہنچائی جا چکی تھیں اور چوتھی اڑان لینڈ کر کے سامان رسد اتارا جا رہا تھا کہ دہشت گردوں نے راکٹ داغنے شروع کر دیئے تھے ۔ پہلا راکٹ دائیں انجن کو لگنے کے بعد اب یہ ہیلی 180 ڈگری کا موڑ کاٹتے ہوئے واپس خار قلعے کی طرف محو پرواز تھا۔ ٹیک آف کے تین منٹ بعد ہیلی کاپٹر کے پچھلے حصے میں دھواں بھرنے لگا تھا اور تقریباً مزید تیس سیکنڈ بعد انجن سے شعلے اٹھنے لگے تھے۔

کیبن کا انٹرکام بھی فیل ہو چکا تھا، کیپٹن ذیشان چیخ چیخ کر اپنے کیپٹن آف دی ائیر کرافٹ کو رفتار کم کرنے اور سطح زمین سے بلندی کم کرنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ فلائٹ انجینئر حوالدار ازرم نے انھیں پچھلے حصے میں لگی آگ میں ہوتے ہوئے مسلسل اضافے سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ میجر ہمایوں اور معاون ہوباز کیپٹن ذیشان نے تمام انسٹرومنٹ، وارننگ کاشن لائٹس اور کنٹرول ٹھیک پا کر ٹیک آف کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ ایک بہت ہی نازک اور مشکل فیصلہ تھا جو میجر ہمایوں نے بغیر کوئی وقت ضائع کئے لیا تھا۔ اگر وہ صرف چند سیکنڈ مزید غور وخوض میں صرف کرتے یا جہاز کو چھوڑ کر مناسب فاصلے تک اپنے عملے کو لے جانا چاہتے تو دوسرا راکٹ ہرگز انہیں اس کی مہلت نہ

دیتا کیونکہ پہلی دفعہ انجن کو چھوتے ہوئے گزرنے والے راکٹ کے بعد اب دوسرا راکٹ شست میں چند درجوں کی تصحیح کے ساتھ چند ہی سیکنڈز میں ہیلی کاپٹر کے درمیان لگنا تھا اور باقی عملے کے ساتھ ساتھ دونوں ہوابازوں کے بھی پرخچے اڑ جانے تھے۔ دراصل میجر محمد ہمایوں کے لئے یہ صورت حال کوئی نئی نہ تھی، وہ پہلے بھی متعدد بار قضا سے پنجہ کش رہ چکے تھے اور عین موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اعصاب کو قابو میں رکھنا اور درست فیصلہ کرنا، ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔

جب 2005 میں وانا کے قریب تیارزہ میں رسد بہم پہنچانے کے مشن کے دوران ان کے ہیلی سے صرف 20 میٹر کی دوری پر دو راکٹ پھٹے جن کا ہدف ان کا ہیلی تھا تو بھی میجر ہمایوں نے پورے اطمینان سے ٹیک آف کیا تھا اور اگلے ہی لمحے تیسرے راکٹ فائر کی آواز انھیں عقب میں سنائی دی تھی۔ تب میجر ہمایوں کا جہاز خیریت سے وانا میں لینڈ ہوا تھا۔ وانا میں ابھی شکرانے کے نوافل ادا ہی کئے تھے کہ تیارزہ سے ہی دوبارہ ایس او ایس پیغام موصول ہوا کہ دو آفیسرز اور 6-7 سولجرز کی حالت تشویشناک ہے اور جلد از جلد سی ایم ایچ پہنچانے کی ضرورت ہے، اس صورت حال میں یہ سربکف ہواباز پھر ہیلی کاپٹر لے کر تیارزہ پہنچا اور زخمیوں کو اٹھا کر فیلڈ ہسپتال وانا پہنچایا۔ یہاں ڈاکٹروں کی ایک گھنٹے کی سرتوڑ کوشش کے باوجود تین سولجرز شہید ہو گئے اور پھر باقی زخمیوں کو راولپنڈی سی ایم ایچ پہنچانے کا مشن بھی میجر ہمایوں نے پورا کیا تھا۔

2005 میں چمالئی اور جنڈولہ کے درمیان سے 15 شہداء کے جسد خاکی اٹھا کر سی ایم ایچ کھاریاں لانے کا فریضہ بھی اسی ہواباز نے ادا کیا تھا۔ ایک دفعہ پش زیارت میں جب آپریشن جوبن پر تھا اور خطروں کا یہ کھلاڑی کمانڈوز کو ڈراپ کر رہا تھا تو اچانک 12.7 ملی میٹر اینٹی ائیر کرافٹ گن کا فائر ہیلی پر آنے لگا، بالاکمان سے حکم ملا کہ رزمک کی طرف مڑ جاؤ اور اگلے حکم کا انتظار کرو، اتنے میں رزمک کی شمالی جانب سے بھی 12.7 ملی میٹر اینٹی ائیر کرافٹ گن کا بھاری فائر آنے لگا، اب حکم ملا کہ دوبارہ ہدف کی طرف جاؤ اور مشن مکمل کرو۔ دوبارہ پلٹ

کرلینڈ نگ کرنے کے لئے پرواز نیچی کی تو زمین سے صرف دس گز کی بلندی پر اطلاع ملی کہ نیچے دشمن تاک میں ہے اور نشانہ بنائے گا لہٰذا لینڈ نہ کیا جائے۔ یہ مشورہ پہلے سے ہدف پر موجود کمانڈوز نے دیا تھا جو کچھ دیر پہلے اسی ہیلی کاپٹر کی مدد سے ہی اتارے گئے تھے۔ میجر ہمایوں نے یہیں سے جہاز کو سنبھالا اور واپس پلٹے، دوسرے ہی لمحے عقب میں ایک خوفناک دھماکہ سنائی دیا۔ یہ راکٹ بھی یقیناً ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنانے کے لئے فائر کیا گیا تھا جو میجر ہمایوں کے بروقت پلٹنے سے ہیلی کاپٹر کو نہ چھو سکا۔ اس طرح صرف تین گھنٹوں میں میجر ہمایوں اب تیسری بار موت کو مات دے کر بحفاظت واپس میران شاہ میں لینڈ کر رہے تھے۔

2008 میں ایک بار اقوام متحدہ کے امن مشن کے تحت سوڈان میں شدید موسم نے اس ہوا باز کی صلاحیتوں کا امتحان لینا چاہا تو اس وقت ان کی پرواز کے 500 گھنٹوں کا تجربہ بھی ان کی قوت اعتمادی میں شامل تھا۔ انتہائی اعصاب شکن صورت حال پر قابو پا کر اپنے ہیلی کاپٹر کو بحفاظت موسم کے خونی پنجوں سے نکالا اور لینڈ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اقوام متحدہ میں مزید 200 گھنٹوں کی پرواز کا تجربہ اپنے پلے باندھا اور اب پھر سے کبھی لواری ٹنل تو کبھی میران شاہ اور کبھی بلوچستان تو کبھی سوات، باجوڑ اور بونیر میں قضا اور میجر محمد ہمایوں باہم پنجہ کش تھے۔

آج پھر موت سے آنکھ مچولی کھیلنے والے یہ ہوا باز موت سے ہی نبرد آزما تھے۔ نیچے سنگلاخ پہاڑوں کی تیز دھار چوٹیاں اور فضا میں ہر لمحہ گھیرا تنگ کرتے ہوئے آگ کے شعلے۔ تقریباً آدھا ہیلی کاپٹر منٹوں میں جل کر کوئلہ ہو چکا تھا۔ میجر ہمایوں کے پاس اب کوئی چارہ نہ تھا۔ نواپاس سے خار قلعے کا فاصلہ ساڑھے 18 ناٹیکل میل تھا اور میجر ہمایوں اپنے ہیلی کاپٹر کو دہشت گردوں کے نرغے سے زیادہ سے زیادہ دور لے جانا چاہتے تھے۔

اب تک یہ ہیلی کاپٹر نواپاس سے تقریباً 15 ناٹیکل میل کا ہوائی سفر خار کی طرف طے کر چکا تھا۔ ہوا بازوں کو اب ہنگامی لینڈنگ کے لئے زمین کے ہموار ٹکڑے کی تلاش تھی۔ ویسے بھی کیپٹن ذیشان کی بھرپور تلاش کے باوجود ابھی تک لینڈنگ کی کوئی جگہ مل نہیں پائی تھی۔ فلائٹ

انجینئر حوالدار ازرم ان کے کیبن میں موجود تھے اور مسلسل تکنیکی اعانت مہیا کر رہے تھے۔ وہ متعدد حربی مشقوں کے علاوہ دہشت گردوں کے خلاف آپریشن المیزان، آپریشن راہ راست اور آپریشن راہ نجات میں بھی حصہ لے چکے تھے۔ کیپٹن ذیشان زور زور سے چیخے: ''سر وہ سامنے ہنگامی لینڈنگ کی جگہ نظر آ رہی ہے، سر رفتار کم کریں، پرواز نیچی کریں۔'' اس گھڑی میں کیپٹن آف دی ائیر کرافٹ میجر محمد ہمایوں نے اپنے حواس پر مکمل قابو رکھا اور اپنے بھرپور حربی تجربے، کمال ذہانت اور مضبوط اعصاب کو استعمال کرتے ہوئے اور انتہائی تیز رفتاری سے غوطہ مارتے ہوئے لینڈنگ کے لئے بڑھے۔ جب زمین صرف ایک سو میٹر کے لگ بھگ رہ گئی تو اچانک جہاز کا خود کار ہائیڈرالک سسٹم فیل ہوگیا، میجر ہمایوں نے معاون ہوا باز کیپٹن ذیشان کو پکارا کہ فوراً کنٹرول پر آجاؤ، اس طرح دونوں ہوا باز اب میکانکی کنٹرول سے جہاز کو لینڈ کرا رہے تھے۔ زمین سے ابھی دس میٹر کی بلندی پر ہونگے کہ یکدم جہاز کا ٹیل روٹر بھی فیل ہوگیا۔ اس لمحے بھی اس فولادی اعصاب کے مالک ہوا باز نے آخری فیصلہ لیا اور جہاز کو سوئچ آف کر دیا، یہ شاید ہیلی کاپٹر کے پھٹنے میں چند مزید منٹ حاصل کرنے کی تکنیک تھی۔

جہاز نے زمین کو چھوتے ہی پوری قوت سے 350 درجے کا چکر کاٹا اور اسی رخ پر رکا جس پر ہنگامی لینڈنگ کرائی جا رہی تھی۔ یہ منظر کچھ فاصلے پر موجود پاک فوج کی چیک پوسٹ کا عملہ بھی دیکھ رہا تھا اور ایک آفیسر نے جہاں زور زور سے اپنی موبائل گشت کو حادثے کے مقام پر پہنچنے کا حکم دیا، وہیں یہ منظر اپنے موبائل میں ایک ویڈیو کی شکل میں محفوظ بھی کر لیا۔ فضا میں پہلے سے موجود بیل 412 اپنی مجوزہ رفتار سے تیز پرواز کرتے ہوئے جلد ہی حادثے کے مقام پر پہنچ گیا تھا۔ یہ پاک افغان سرحد کے قریب باجوڑ ایجنسی میں نواگئی کے پاس سرکاری قلعہ کا مقام تھا۔ جبری لینڈنگ کرنے والے کیپٹن آف دی ائیر کرافٹ میجر ہمایوں زخمی ہونے کے باوجود پوری طرح ہوش میں تھے اور لینڈنگ کے ساتھ ہی چھلانگ مار کر ہیلی کاپٹر سے الگ ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ان کی ٹھوڑی کے نیچے کٹ تھا جبکہ ٹخنے اور رانوں پر ورم آیا تھا۔ جبکہ

معاون ہوابازکیپٹن ذیشان نیم بیہوش تھے۔جہاز کے خوفناک جھٹکےاور 360 درجے کے چکر میں انہیں کمر، کہنی اور پاؤں میں شدید چوٹیں آئی تھیں اور ران کا پستول نشست کے ساتھ بری طرح الجھا ہوا تھا۔

دہشت گرد بھی اس ہیلی کاپٹر پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ہنگامی لینڈنگ کے ساتھ ہی قریبی گاؤں سے مارٹر کے گولے برسنے لگے تھے۔بیل 412 کے معاون پائلٹ میجر وقار تیزی سے آگے بڑھے اور کیپٹن ذیشان کو ایم آئی 17 کی نشست سے آزاد کرا کے بیل 412 تک پہنچایا۔اب میجر ہمایوں نے حوالدار ازرم کے بارے میں سوچا جو لینڈنگ کرتے ہوئے تو ساتھ ہی تھے اور قبل از لینڈنگ چیک بھی دہرا رہے تھے،لیکن جونہی لینڈ کر چکے تو غائب تھے،انہوں نے میجر وقار سے درخواست کی کہ ایک بار پھر ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کیبن کو چیک کریں، حالانکہ میجر وقار نے پہلے بھی چیک کیا تھا اور انھیں کیبن میں کیپٹن ذیشان کے علاوہ کوئی اور نظر نہ آیا تھا۔لیکن کیپٹن آف دی ائیر کرافٹ کے یقین اور خواہش کے احترام میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر پھر پلٹے۔ میجر وقار ابھی ایم آئی 17 کی جانب بڑھے تھے کہ جہاز ایک زوردار دھماکے سے پھٹ گیا۔کیپٹن ذیشان ابھی تک بیہوشی کی حالت میں تھے،انھیں نیم بیہوشی میں جہاز سے نکال کر باہر لے جاتے ہوئے اتنا یاد تھا جیسے کوئی غیبی ہاتھ انہیں کھینچ کر ہیلی کاپٹر سے نکال رہے تھے اور اسی عالم میں وہ مکمل بیہوش ہو گئے۔بس ایک دھماکے کی موہوم سی آواز لاشعور میں گونجی تھی۔دوسرے ہی لمحے ایم آئی 17 ایک خوفناک دھماکے سے پھٹ چکا تھا۔

بیہوشی کی حالت میں کیپٹن ذیشان کے تخیل میں موت اور زندگی سے نبرد آزمائی کی فلمیں یکے بعد دیگرے چلنے لگیں۔اگست 2006 کا منظر ان کے سامنے تھا جب بلوچستان میں ان کے ایم آئی 17 پر کتنی ہی گولیاں لگی تھیں لیکن ماں کی دعا ان کے ساتھ تھی۔ان کا معمول تھا کہ کسی بھی آپریشن پر جاتے ہوئے فون پر ماں سے دعا کی درخواست ضرور کرتے تھے۔تب آپریشن کی کامیاب تکمیل پر ان کے کیپٹن آف دی ائیر کرافٹ کو تمغہ بسالت سے نوازا گیا تھا۔

منظر بدلا اور اپریل 2009 کی فلم ان کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔ سکواڈرن کمانڈر اپنے سکواڈرن کے آفیسرز اور سولجرز سے مخاطب تھے، ''بونیر میں دہشت گردوں کی ایک بڑی تعداد نے ہمیں للکارا ہے۔ وہاں آپریشن میں نقصان کا اندیشہ کافی زیادہ ہے، شاید ہم میں سے آدھے سے زائد لوگ واپس نہ آسکیں۔'' کیپٹن ذیشان نے تب بھی آگے بڑھ کر سب سے پہلی جنگی پرواز کے لئے خود کو رضا کارانہ طور پر پیش کر دیا تھا۔ یہ آپریشن کامیابی سے ہمکنار ہوا ہی تھا کہ سوات کا امن معاہدہ ٹوٹ گیا اور اب ایک انتہائی مشکل اور خونخوار آپریشن متوقع تھا۔ اس آپریشن میں پاکستان آرمی ایوی ایشن نے دنیا میں بلندترین مقام پر لینڈنگ کر کے دہشت گردوں کا سامنا کرنا تھا۔ آپریشن کی کامیابی کا انحصار ایوی ایشن کی بلا کنگ پوزیشن پر تھا۔ اس آپریشن میں بڑا جانی نقصان ہونا آشکار تھا۔ کیپٹن ذیشان اس موقعے پر بھی سب سے پہلی لینڈنگ کرنے والے تین ہیلی کاپٹرز (ایم آئی 17) میں سے ایک کے عملے کا حصہ بنے۔ اس آپریشن کے تیسرے ہی دن پاکستان فوج کے چیف آف جنرل سٹاف نے آرمی ایوی ایشن بیس 'غازی' میں جا کر فرط جذبات میں کہا تھا، ''میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس آپریشن میں حصہ لینے والے ایوی ایشن عملے کو سلیوٹ پیش کروں۔'' اب ان کی آنکھیں جو مشاہدہ کر رہی تھیں، وہ بڑا بھیانک تھا، 3 جولائی 2009 اورکزئی ایجنسی میں دہشت گردوں سے نبرد آزما ایم آئی 17 کریش ہوا اور تمام عملہ ہوا باز سمیت شہید ہو گیا تھا، ایسے موقع پر ایوی ایشن کی سنہری روایات کے مطابق اگلا مشن ہمیشہ سکواڈرن کمانڈر ذاتی طور پر لے کر جاتے ہیں۔

اگلا درپیش مشن سوات کا تھا، جس میں خطرات سے بھرپور علاقے میں سامان رسد ذخیرہ کرنا تھا۔ ذیشان نے ایک بار پھر خود کو رضا کارانہ طور پر پیش کرتے ہوئے یہ مشن بھی لے لیا تھا۔ ذیشان کے تخیل کا منظر پھر بدلا۔ 24 اکتوبر 2009 کو جب اس ہیلی کاپٹر نے سامان کی 3 پروازیں نوا پاس تک پہنچا دیں تو نماز ظہر کا چھوٹا سا وقفہ کر کے پھر سے عازم پرواز ہوئے۔ اس ہیلی کاپٹر کے عملے میں شامل سبھی لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ وہ کسی سٹیلتھ

ہیلی کاپٹر پر سوار نہیں تھے بلکہ ایم آئی سترہ جیسے بڑے حجم اور آواز والے کارگو ہیلی کاپٹر کی صورت میں ایک بڑا ہدف لئے بار بار دہشت گردوں کے سامنے سینہ سپر تھے۔ ایسی صورت میں مسلسل کسی ایک ہی مخصوص علاقے میں چوتھی اڑان لے جانے کا مطلب بلا شبہ جان ہتھیلی پر رکھ کر ہی اپنے بالا حکام کی منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانا تھا۔

کیپٹن آف دی ائیر کرافٹ میجر ہمایوں کے ساتھ آج پھر کیپٹن ذیشان کو بطور معاون ہوابازاس لئے لگایا گیا تھا کہ وہ اس نوعیت کے کئی آپریشنز کا تجربہ رکھتے تھے اور آپریشنز اور خطرات میں ہوابازی کے حوالے سے ذیشان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہ تھا۔ پھر انھیں آخری منظر دکھائی دیا جب وہ ہائیڈرالک فیل ہوجانے کے بعد اپنے ساتھی ہوباز کے ساتھ جہاز لینڈ کر رہے تھے اور یکا یک جہاز گھوما تھا جس میں انھیں شدید چوٹیں لگی تھیں اور پھر کوئی انھیں بیہوشی کی حالت میں ہیلی کاپٹر سے نکال کر لے گیا تھا۔

اب انہیں ہوش آنے لگا تھا، ان کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا، ''میرے ہیلی کاپٹر کا عملہ کہاں ہے؟ میرے ہیلی کاپٹر کا عملہ کہاں ہے؟'' ان کے لاشعور میں محفوظ ہیلی کاپٹر پھٹنے کا دھماکہ انھیں یہ باور کرا رہا تھا کہ لونہ سیداں، تحصیل کہوٹہ کے رہنے والے فلائٹ انجینئر حوالدار ازرم شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز ہو چکے تھے، اس ہیلی کاپٹر کے عملے کے مزید دو ارکان بھی شاید چند لمحے پہلے جام شہادت نوش کر چکے تھے، یا پھر جہاز کے آخری 360 درجے والے جھٹکے میں دور جا گرے تھے۔ ان میں لانڈھی، کراچی کے رہنے والے چیف کروحوالدار ندیم محی الدین ایک منجھے ہوئے کوچیف تھے اور کیبن میں لگی ہوئی آگ کے شعلوں میں بھی اپنے حواس بحال رکھتے ہوئے پائلٹ کو ممکنہ لینڈنگ سائٹ کی تلاش میں بھرپور اعانت فراہم کر رہے تھے۔ حوالدار ندیم نے بھی آپریشن المیزان اور آپریشن راہ نجات میں کئی کامیاب مشن کئے تھے۔ عملے کے تیسرے رکن جو شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے، وہ بابو محلہ تحصیل و ضلع مردان کے نوجوان نائیک ندیم خان تھے جو اس جہاز پر سیکنر کے فرائض انجام دیتے ہوئے شہید ہوئے۔ جب ان کا کیبن شعلوں میں گھرا

ہوا تھا اور ریڈیو رابطہ بھی خراب ہو چکا تھا تو نائیک ندیم خان پوری مہارت سے پائلٹ کے ساتھ ہر ممکن طریقے سے ممکنہ لینڈنگ سائٹ کے بارے میں رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ جہاز کے پھٹنے کے بعد ان کا جسد خاکی بھی ملبے سے کچھ فاصلے پر ملا تھا۔ قضا نے شہادت کا جام ان تینوں جانبازوں کے لئے مخصوص کر رکھا تھا، جبکہ میجر ہمایوں جہانزیب اور میجر محمد ذیشان آج بھی بطور غازی پاکستان آرمی ایوی ایشن کے لئے فخر اور قیمتی سرمایہ ہیں۔

*****

شکریہ۔۔۔پاک فوج

خدیجہ محمود

.....•••.....

جس طرح ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ۔اسی طرح میری نظر میں پاک فوج سے تعلق رکھنے والا ہر فرد خواہ سپاہی ہو یا جرنیل، آسمانِ شجاعت کا ایک درخشندہ ستارہ ہے جس کے سینے پر کسی نہ کسی قربانی کا تمغہ سجا ہوا ہے اور وہ قربانی صرف دفاعِ وطن کے مقدس فریضہ کے دوران رتبۂ شہادت پر فائز ہونے کی ہی نہیں بلکہ خون کو جماتی ہوئی سیاچن گلیشیئر جسے برف کا صحرا کہیں تو مناسب ہوگا کی سردی میں تو کبھی جھلسا دینے والی ریگستان کی گرمی میں اپنے تمام پیاروں سے دوری دورانِ تربیت زخمی ہو کر یا کسی آپریشن میں جسم کے کسی حصے کی تاعمر معذوری کی صورت میں بھی شامل ہے اور پھر بھی وہ مسکراتے ہوئے کہتے ہیں کہ:"اے وطن!ہم ہیں تیری شمع کے پروانوں میں" بظاہر یہ چمکتی ہوئی کلف زدہ بے شکن فوجی وردی ہے لیکن اپنے اندر اَن گنت داستانیں سموئے ہوئے خاموشی کی زبان میں بہت کچھ سناتی ہے، جو شاید صرف چند اہلِ دل ہی سمجھ پاتے ہیں۔

آج کا مضمون ان Unsung Heroes کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی ایک چھوٹی سی کاوش ہے جو اس پاک وطن کے عشق میں چور اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

زمانے میں ادا کرتے ہیں جب بھی رسمِ شبیری
تو نوکِ خنجرِ باطل پہ بھی سر رقص کرتا ہے

اپنی اس تحریر میں میں چاہ کر بھی لفاظی نہیں کر پاؤں گی کیونکہ میرے وطن کے وہ گمنام سپاہی جن کے سینوں میں دل کی جگہ پاکستان دھڑک رہا ہے، وہ کسی ستائش کی پروا کئے بغیر اس

ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ان کا صرف ایک ہی جنون، ایک ہی عشق اور ایک ہی ایمان ہے۔ جس کا نام پاکستان ہے۔

کچھ صحافی اور اینکر حضرات پرنٹ الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے مختلف میڈیم پر پاک فوج کے خلاف ہرزہ سرائی کر کے اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کی کوشش میں مصروفِ عمل ہیں۔ان سب سے مخاطب ہو کر یہ کہنے اور لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں کہ پاکستان میں ایک ہی توادارہ ہے جس کے نمائندگان نہایت یقین سے اس ملک کے شہریوں کو اعتماد دلاتے ہیں کہ ''تم سکون کی نیند سو لو پاک فوج جاگ رہی ہے۔''

کچھ حب الوطنی کے دعوے داروں کا اعتراض ہے کہ ملک کے بجٹ کا 70 فیصد حصہ پاک فوج پر خرچ ہوتا ہے۔ان سے درخواست ہے کہ ذرا غور سے اعداد و شمار کو دیکھیں، پالیسیوں پر نظر دوڑائیں اور عینک کے دھندلائے شیشے صاف کریں تو صاف نظر آ جائے گا کہ 50 فیصد سے اوپر بجٹ تو قرض اتارنے کی مد میں صرف ہوتا ہے اور باقی تمام اخراجات کے بعد دفاعِ وطن پر ملک کا 17 فیصد سے بھی کم بجٹ تینوں افواج پر خرچ کیا جاتا ہے۔اگر اس دعوے پر کسی کو شبہ یا اعتراض ہے تو وہ کسی بھی سینئر تجزیہ کار صحافی یا اکانومسٹ جو اس مضمون میں کمال رکھتے ہیں اعداد و شمار کے حوالے سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ہمارے چند دانشور یہ بھی کہتے سنائی دیتے ہیں کہ پاک فوج اپنے فرائض کی انجام دہی کی تنخواہ لیتی ہے تو سرکار پھر یہ بھی بتا دیں کہ آپ کے بازار میں خون کن داموں فروخت ہوتا ہے؟ سہاگنوں کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی کیا قیمت ہے؟ وہ نو بیاہتا دلہن جس کے ہاتھوں کی مہندی بھی ابھی پھیکی نہیں ہوئی اور جس کی آنکھوں میں لمبی راتوں میں نیند کی جگہ انتظار جم گیا ہے۔ایک نہ ختم ہونے والا انتظار اس کی کیا بولی لگائیں گے آپ؟

ایک بوڑھی ماں جس کا جوان بیٹا اس دھرتی کی مٹی کو سیراب کر گیا اپنے لہو سے۔۔۔اس کی خالی کوکھ کی قوتِ خرید کی جرأت کر سکتے ہیں آپ؟ وہ بچے جن کے باپ یہ کہہ کر جاتے ہیں کہ عید کے کپڑے لے کر آئیں گے۔وہ اس آس میں دن گزارتے ہیں کہ نئے کپڑے ملیں گے۔ان کو کپڑے ملتے ہیں لیکن باپ کے، وہ بھی لہو سے تر اور سبز ہلالی پرچم۔۔۔اس ٹوٹی ہوئی آس کو

آپ کتنے میں خرید سکتے ہیں؟

پوچھنے پر آؤں تو نہ جانے ان صاحبانِ علم ودانش سے کتنی چیزوں کے دام پوچھ سکتی ہوں لیکن جانے دیجئے صاحب، آپ کی ان باتوں کے باوجود سلام ہے ان مٹی کے بندوں کی دیوانگی پر جو کسی نہ کسی آپریشن یا تربیتی مراحل میں ہونے والی ساری عمر کی معذوری کے باوجود بھی اپنے اندر سے جذبۂ حب الوطنی ختم نہ کر سکے۔

گفتار کے ان غازیوں پر حیرانی بھی ہوتی ہے کہ وہ اس مملکتِ خداداد پاکستان کے ٹوٹنے کی بات کس منہ سے کرتے ہیں۔ اس کی برائیوں کو محدب عدسے سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے ہیں اور پھر ایک نہ ہونے والی ہولناک تباہی کی خوفناک عکاسی کرتے ہیں۔ جب زلزلہ آتا ہے، سیلاب آتا ہے یا کوئی اور مشکل وقت تو اس کا سامنا پاک فوج کو کرنا پڑتا ہے اور یہ محبِ وطن کسی اخبار یا چینل پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے اس ملک سے محبت کا ثبوت نہیں دیتے بلکہ ایمرجنسی میں فوری طور پر امدادی کارروائی کے لئے پہنچتے ہیں۔ مخیر حضرات اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے ضرورت کا سامان ضرور فراہم کر دیتے ہیں لیکن خطرناک مقامات پر پہنچاتا کون ہے؟ پاکستان اور افواج میں خامیاں نکالنے والوں سے ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا ان کے علم میں نہیں کہ برادر اسلامی ممالک کہ جن کی ہزاروں سال پرانی تاریخ ہے اور وسائل کے انبار ہیں، کیا وہ جدید آلاتِ حرب میں باقی دنیا کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ کے فضل وکرم سے ہر قسم کا جدید اسلحہ، ٹینک، میزائل، جہاز، ماشاءاللہ نہ صرف پاکستان میں بنتے ہیں بلکہ ان میں سے کچھ اسلحہ جات برآمد بھی کئے جاتے ہیں۔ کیا ان کے کان اس نعرۂ تکبیر کی گونج سے محروم ہیں جو بھارت کے پرتھوی میزائل کے جواب پر غوری میزائل کے کامیاب تجربے کے بعد پوری دنیا کو سنائی دیا تھا۔

پاکستان کئی امتحانات سے دوچار ہوا، تاہم دشمن نے جب بھی بیرونی سرحدوں پر للکارا، افواج پاکستان نے اس کا منہ توڑ جواب دیا۔ ہماری قوم اور افواج نے مل کر دہشت گردوں کے

عزائم کو ناکام بنایا ہے۔ بیرونی عناصر پاکستان کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں لیکن بفضلِ تعالیٰ پاکستان جو خدا کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ وہ تھا، وہ ہے اور انشا اللہ قیامت تک رہے گا۔ تاریخ اپنے آپ کو ہمیشہ دہراتی رہے گی، زندہ رکھے گی۔ غوری کے سامنے ہمیشہ پرتھوی شکست کھائے گا۔

پاکستان کا دفاع یقیناً ناقابلِ تسخیر ہے۔ اب دشمن ہم پر براہِ راست وار نہیں کر پا رہا لیکن معصوم عوام کے ذہنوں میں خوف پھیلانے کی مجرمانہ کوشش ضرور کر رہا ہے اور نہ جانے کیوں کچھ لوگ کم علمی اور کچھ بد دیانتی کی وجہ سے پروپیگنڈا کا حصہ بن جاتے ہیں اور جس کی ایک مثال یہ جعلی سکیورٹی الرٹس ہیں جو سوشل میڈیا کے ذریعے پہنچائے جا رہے ہوتے ہیں۔ اس بارے میں بھی عوام کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ پاک فوج کا ادارہ آئی ایس پی آر کبھی بھی WhatsApp پر عوام کو ایسی خبریں نہیں دیتا۔ الحمدللہ! پاک فوج ہر قسم کے حالات سے نپٹنا جانتی ہے اور یہ عاقبت نااندیش جو اس پروپیگنڈا کا حصہ بن رہے ہیں، ان سے دست بستہ التجا ہے کہ خدارا آنکھیں کھولیں کیونکہ اگر آپ اب بھی نہ جاگے تو تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی، داستانوں میں۔

اس مضمون کو لکھنے کے دوران ہی مجھے میری پاک فوج کی دو ہستیوں کے بارے میں خبر ملی کہ لیفٹیننٹ خاور اور کیپٹن جنید فضل جسم پر تازہ لہو کے چھینٹے لئے جنونِ عشق اور حدودِ عشق کی تمام منازل طے کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر کے حیاتِ جاودانی پا چکے ہیں۔

شہیدو! تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں

اگر میرے اس مضمون کو پڑھ کر دل پر مادرِ وطن کے ان جاں نثاروں کے لئے کسی ایک دھڑکن کی سلامی بھی محسوس کریں تو میں اس کو اپنی پاک فوج کے شہیدوں اور غازیوں سے عقیدت کا ثمر سمجھوں گی اور ایک بار پھر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے:

شکریہ۔ پاک فوج

*****

تم ہی سے اے مجاہدو جہاں کا ثبات ہے

گروپ کیپٹن مشکور حسین

.....◆◆◆.....

''سر یاد ہے! پہلے ہیڈ لیور(Head Lever) اور پھر سیٹ لیور(Seat Lever)۔اس نے ایک بار پھر میرا دھیان بریفنگ میں بتائی گئی چیک لسٹ اور ہنگامی اقدامات کی جانب مبذول کرادیا۔ میں کینو چھیلتے چھیلتے رک گیا۔''یار یہ مجھے بالکل یاد ہے''اور میں نے Ejection کا طریقہ کار دہرانا شروع کر دیا۔وہ بھی میرے پیچھے پیچھے دہرا رہا تھا تا کہ اگر میں کہیں غلطی کروں یا بھول جاؤں تو وہ مجھے یاد کروادے۔میں نے چٹکیاں لیتے ہوئے کہا:''یار! موت جب آنی ہے تو آنی ہے۔''وہ بولا:''آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر جیسا کہ ایم ایم عالم نے کہا کہ یہ دعا ہے کہ موت جب آئے تو شیروں کی طرح، جوانمردوں کی طرح آئے۔''اس نے چاکلیٹ سے بھری طشتری میری طرف بڑھادی۔ میں نے ایک اٹھائی اور کھانا شروع کی۔''سر ایک اور لیں آپ کو شوگر لیول کی ضرورت پڑے گی۔''سنہری پنی میں لپٹی ہوئی یہ چاکلیٹ نہایت لذیذ تھی۔ہم دونوں چاکلیٹ کا مزہ لیتے عمارت سے باہر آئے اور جہاز کی طرف روانہ ہوئے۔میں نے بے دھیانی میں چاکلیٹ کا کاغذ اپنی جیب میں ڈال لیا۔میں اس سے پہلے بھی چند مرتبہ سرگودھا میں ونگ کمانڈر جمال آفریدی سے سرسری سی ملاقات کر چکا تھا اور اس طرح ہم دونوں کے درمیان ایک واقفیت سی پیدا ہوگئی تھی، مگر اس بار تو بات ہی کچھ اور تھی۔ہم دونوں نے ایک ہی میراج طیارے میں پرواز کرنا تھی اور مجھے GIBS {Guy in Back Seat} کے طور پر JF-17 تھنڈر کی ایوی ایشن فوٹو گرافی کرنا

تھی۔ ونگ کمانڈر جمال آفریدی سرگودھا میں تعینات میراج طیارے کے سکواڈرن میں بطور فلائٹ کمانڈر آپریشنز کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ ایک وجیہہ، پروقار اور قدآور شخصیت کا مالک تھا اور اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیلتی ہوئی نظر آتی یعنی بالکل جیسے کہ ہیرو ہوا کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی شخصیت اور انداز گفتگو سے کوئی بھی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے قوم کے ان سپوتوں پر فخر ہے جو اپنی صلاحیتوں کو اس قدر اجاگر کر لیتے ہیں کہ یک لخت دشمن کے دانت کھٹے کر سکیں۔

ونگ کمانڈر جمال آفریدی سے میری وہ ملاقات بڑی یادگار تھی۔ ایک دن اچانک ان کی شہادت کی خبر ملی جس نے مجھے چونکا دیا اور اُن سے ہونے والی یادگار ملاقات میری آنکھوں کے سامنے فلم بن کر چلنے لگی۔

15 جنوری کی صبح سرگودھا سے تین میراج طیارے اپنی معمول کی تربیتی پرواز کے لئے روانہ ہوئے۔ ان میں سے دو اپنا مشن مکمل کر کے واپسی کے لئے مڑے اور ایک طیارہ جس کا کام ابھی تکمیل کے مراحل میں تھا اس کا رابطہ کنٹرول ٹاور سے منقطع ہوگیا۔ اچانک خبر آئی کہ پاک فضائیہ کا ایک میراج طیارہ منڈی بہاؤالدین کے قریب گر کر تباہ ہوگیا ہے۔ میں نے بدحواسی کے عالم میں مختلف دفاتر سے معلومات حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ غیر ارادی طور پر میں نے جیکٹ کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اسی چاکلیٹ کا سنہری کاغذ نکل آیا۔ نہ جانے کیوں میری کیفیت میں بے چینی کہیں سے عود کر آئی تھی۔ پاک فضائیہ نے حادثے کی تحقیقات کا حکم جاری کر دیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ریسکیو ٹیم کا ہیلی کاپٹر جائے حادثہ پر پہنچ گیا۔ ہیلی کاپٹر سے اتر کر لوگ باہر آئے اور طیارے کا ملبہ زیر معائنہ تھا۔ معلوم ہوا کہ جاں بحق ہونے والے پائلٹ ونگ کمانڈر جمال آفریدی اور زیر تربیت پائلٹ فلائنگ آفیسر سعد سلمان ہیں۔ طیارے کے ملبے سے کہیں کہیں دھواں اٹھ رہا تھا۔ قریب کی بستی کے بہت سے لوگ ملبے کے اردگرد جمع تھے۔ میں اسی اثنا اس سوچ میں غلطاں تھا کہ اسے اپنا Ejection کا سبق کیسے بھول گیا؟

عینی شاہدین میں سے ایک ادھیڑ عمر باریش دیہاتی شخص آگے لپکا اور مخاطب ہوا۔ ''صاحب جی! صاحب جی!'' اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور آنکھوں سے خوف عیاں تھا۔ ''میں مسجد کی چھت پر کھڑا تھا کہ میں نے اس جہاز کو بہت تیزی سے نیچے کی طرف آتا ہوا دیکھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ بس سیدھا بستی پر گرے گا۔ مگر بستی میں داخل ہونے سے پہلے ہی پائلٹ نے اس کا رخ موڑ دیا اور یہ بستی سے دور یہاں زمین سے ٹکرا گیا۔'' اس حادثے میں کسی قسم کا کوئی جانی و مالی نقصان نہ ہوا تھا۔

لو جی! اس کو اپنا سبق یاد تھا۔ بالکل یاد تھا۔ جس نے ایک شخص کی جان بچائی، اس نے ساری انسانیت کو بچایا۔ وہ میرا ہیرو اپنا سبق کیسے بھول سکتا تھا۔ ونگ کمانڈر جمال آفریدی چاہتا تو جہاز سے نکل کر اپنی جان بچا لیتا مگر اس نے بستی کو بچانے کے عظیم مقصد میں اپنی کوشش جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس مشن میں فلائنگ آفیسر سعد سلمان کمبیٹ آپریشنل ٹریننگ کے لئے اگلی سیٹ پر براجمان تھے اور ونگ کمانڈر جمال آفریدی بطور انسٹرکٹر پچھلی سیٹ پر تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اس جد و جہد میں کہ کس طرح آبادی کو بچایا جائے، وہ کنٹرول ٹاور سے بات بھی نہ کر پائے۔ اپنی جان پر کھیل کر ان کی یہ کوشش کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ دونوں نے جامِ شہادت نوش کیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ و جاوید ہو گئے۔ یہ فضائیہ کے ہوابازوں کی تربیت کا خاصہ ہے کہ وہ ضرورت پڑنے پر جان کی پروا کئے بغیر مقصدِ عظیم کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔

میں نے اس ادھیڑ عمر دیہاتی کی طرف دیکھا جس نے اب اپنے بیٹے کو بازوؤں میں لیا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی مگر ایک فخر آمیز چمک بھی تھی۔ اپنے پاکستانی ہونے کا فخر اور اپنے محافظوں کی جوانمردی کا فخر۔ یک لخت میں نے بھی ایسا ہی محسوس کیا اور میرا دایاں ہاتھ یک بارگی قوم کے ان جوانمردوں کو سلام کے لئے اٹھ گیا۔ یہ سمجھ آ گیا کہ شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے۔

*****

شہید اعتزاز حسن

لیفٹیننٹ کرنل محمد شفیق ملک

.....•••.....

جنوری کی ٹھٹھرتی صبح پروین بیگم نے بڑے پیار سے اپنے بیٹے کو سکول کے لئے بیدار کیا۔ بچہ لحاف اوڑھے سکول نہ جانے کی ضد کر رہا تھا، شائد کوئی قوت اسے آج گھر سے نکلنے سے روکنا چاہتی تھی لیکن ماں نے بچے کی تعلیم کی خاطر ایک نہ سنی، بچے نے مزید ارنا شتے کی فرمائش کی، شائد اسی بہانے ماں اس کی بات مان لے۔ پروین بیگم نے بڑے چاؤ سے بیٹے کے لئے پراٹھا اور انڈہ بنا دیا جسے کھا کر ننھا اعتزاز، گورنمنٹ ہائی سکول ابراہیم زئی ہنگو کے لئے روانہ ہوا۔

ضلع ہنگو پاکستان کے شمال میں صوبہ خیبر پختونخوا میں واقع ہے جس کی آبادی قریباً پانچ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے، یہ مقام تازہ پانی کے ذخائر اور پھولوں کی کئی اقسام کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔

اعتزاز جب اپنی والدہ کو الوداع کہہ کر سکول کی جانب روانہ ہوا تو سورج بادلوں کی اوٹ سے نکلنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ہنگو روڈ کوہاٹ پر اِکا دکا گاڑیاں چل رہی تھیں، قنبر عباس نے ابھی کریانہ سٹور کھولا ہی تھا۔ گورنمنٹ سکول ابراہیم زئی ہنگو کے لان میں ملیشیا شلوار قمیض اور کالی ٹوپی پہنے بچے جمع ہو رہے تھے۔

اعتزاز حسن، شاہ زیب الحسن اور زاہد علی سکول میں داخل ہونے ہی والے تھے کہ اعتزاز حسن کی نظر ایک 25 سال کے نوجوان پر پڑی جو چادر اوڑھے مشکوک انداز میں سکول کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ چادر سے باہر تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے چادر کے اندر

کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

ننھے اعتزاز حسن نے جو پچھلے دس سال میں دہشت گردی کے ماحول میں بڑا ہوا تھا اور چھٹی جماعت کا طالب علم تھا، فوراً خطرے کو بھانپ لیا، اس نے ایک طرف اپنے سکول کی طرف نظر دوڑائی۔ اظہر سکول اسمبلی کو لیڈ کرنے کے لئے تیار تھا، نوازش، منتظر، ۔۔۔ علی، علی حیدر اور محمد حسین ۔۔۔ پاک سرزمین شاد باد پڑھنے کی تیاری کر رہے تھے جبکہ علی اور حیدر علامہ اقبال کی نظم ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' کی ریہرسل کر رہے تھے، دوسری جانب وہ مشکوک نوجوان تیزی سے سکول کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ایک طرف اعتزاز حسن کے ساتھیوں کا ہجوم تھا جو سکول میں مستقبل کے سہانے خواب سجائے سکول کے صحن میں جمع تھے اور دوسری طرف اعتزاز حسن ایک کٹھن مرحلے سے دوچار تھا۔ اسے فیصلہ کرنا تھا کہ اپنی جان بچائے یا سکول کے بیسیوں ساتھیوں کی۔ علی حیدر کی آواز میں اقبال کی نظم اعتزاز حسن کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی، ''زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری'' اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ننھا اعتزاز حسن مشکوک نوجوان سے لپٹ گیا۔

قنبر عباس ابھی دکان میں چیزیں ترتیب ہی دے رہا تھا، پروین بیگم نے تو ابھی بچے کے ناشتے کے برتن بھی نہ سنبھالے تھے کہ یکا یک دھماکہ ہوا اور اعتزاز کی زندگی کا چراغ بجھ گیا، کلاس میں آخری بینچ پر بیٹھنے والا اعتزاز، آج سب پر بازی لے گیا۔ ہنکو کی فضا میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی، ''زندگی ہو میری پروانے کی صورت یارب، علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب۔'' اعتزاز حسن خود تو شمع کی مانند جل گیا لیکن ابراہیم زئی کے سابق چیئرمین یونین کونسل پیش فرمان کے مطابق وہ ہمیں ایک نیا عزم اور حوصلہ دے گیا کہ ننھے بچے بھی اب تو دہشت گردی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور انشا اللہ اسے ختم کر کے ہی دم لیں گے۔

ننھے اعتزاز حسن کا جسم جب ہوا میں اچھلا تو اس کی آنکھیں اپنے ہم مکتبوں کی طرف اٹھیں۔ ان میں چمک تھی جو کہہ رہی تھیں کہ میں نے اپنا آج تمہارے کل کے لئے قربان کر دیا۔ ننھے

اعتزاز حسن نے شاید اپنی عمر اور اپنے قد سے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ مورخ جب بھی ہماری تاریخ لکھے گا تو وہ حیران ہوگا کہ یہ قوم کیسی کیسی مشکلات سے نہیں گزری، 2005 کا زلزلہ ہو، 2010 کا سیلاب ہو یا دہشت گردی، اس قوم کے حوصلے پست نہیں ہوئے، یہ قوم کل بھی متحد تھی اور آج بھی متحد ہے، دہشت گرد اس قوم کے حوصلے پست نہیں کر سکے۔

اس حقیقت سے کسے انکار ہے کہ دہشت گردوں کو ہتھیاروں کی کمی نہیں لیکن قوم کا حوصلہ سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اعتزاز شہید کے واقعے نے پوری قوم میں امید کی ایک نئی لہر پھونک دی ہے۔ اعتزاز حسن کی قربانی کا اعتراف جہاں پوری قوم نے کیا ہے وہاں عسکری قیادت نے بھی اس کو قابلِ قدر قرار دیا ہے۔

چیف آف آرمی سٹاف، جنرل راحیل شریف نے بجا طور پر کہا کہ وطن کی خاطر جان نچھاور کرنے سے بڑی قربانی کوئی نہیں ہو سکتی۔ عالمی و ملکی ذرائع ابلاغ، پاکستانی قوم اور افواجِ پاکستان نے بجا طور پر اس ننھے ہیرو کو شاندار خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ شہید کی موت دراصل قوم کی حیات ہے اور زندہ قومیں اپنے ہیروز کو ہمیشہ یاد رکھتی ہیں۔ عموماً سوگ صرف 3 روز تک منایا جاتا ہے لیکن آج اتنے دنوں بعد بھی اعتزاز حسن کا ہر زبان پر تذکرہ ہے۔ گورنمنٹ بوائز سکول ابراہیم زئی کے صحن میں پرنسپل لعل صاحب کے اردگرد طالب علم جمع ہیں۔ اظہر تلاوت کر چکا ہے، علی حیدر اور محمد حسین ڈائس پر اقبال کی نظم پڑھ رہے ہیں، شاید ایسے لگتا ہے، ننھا اعتزاز حسن بھی پڑھ رہا ہو:

دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
میرے اللہ ہر برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہے اس راہ پہ چلانا مجھ کو

پورا سکول اشک بار ہے۔محمد ہلال، ریاض علی کی گالوں پر آنسو بہہ رہے ہیں لیکن یہ آنسو کمزوری کے آنسو نہیں بلکہ یہ تشکر کے آنسو ہیں ۔ درحقیقت یہ ایک نئے ولولے اور نئے عزم کا آغاز ہے کہ اس مشن کو تکمیل تک پہنچایا جائے جس کے لئے اعتزاز حسن نے جان دی ہے۔ ماسٹر حبیب علی ویسے تو معمول کے مطابق کلاس ششم میں داخل ہوا کرتے تھے لیکن آج وہ ایک نئے عزم کے ساتھ کرسی پر براجمان ہیں لیکن اعتزاز کا بنچ خالی ہے، شان اور عاکف بائیں جانب اعتزاز کی خالی نشست کی طرف دیکھتے ہیں جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ میری قربانی رائیگاں نہیں جانے دینا۔ میں نے اپنے خواب تم سب پر قربان کر دیئے ہیں۔قمبر عباس نے بسکٹ اور چپس جو اعتزاز کو بہت پسند ہیں اور وہ ہر روز اس سے آ کر خریدتا تھا، سنبھال کر رکھے ہیں کہ ابھی اعتزاز اس سے لینے آئے گا۔ والدہ نے سبز مرچ کے ساتھ سالن تیار کر رکھا ہے، اعتزاز کے کالے دو تیتر خوش ہیں کہ ابھی اعتزاز انہیں آ کر دانہ کھلائے گا۔مجتبیٰ، نازیہ اور زرشیہ بھائی کا انتظار کر رہے ہیں اور میں اعتزاز کے کزن آصف رضا بنگش کی پشتو نظم کا اردو ترجمہ کر کے اسے خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں اور پرامید ہوں کہ یہ قوم اعتزاز کی اس قربانی کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔ جب سے اعتزاز نے موت کو اپنے گلے لگایا،

اس کی ماں فخر کرتی ہے اور میں اس کو سلام پیش کرتا ہوں،

شہید مرتا نہیں یہ قرآن کا فیصلہ ہے،

میں ہر وقت اس قرآنی آیت کو سلام کرتا ہوں،

ساری دنیا جب اعتزاز پہ فخر کرتی ہے،

جب خزاں آتی ہے پھر میں اس کے بعد بہار کو سلام کرتا ہوں،

پاکستان کی فوج نے ہر منزل پہ قربانی دی ہے،

میں اپنی طرف سے پاک فوج کے ہر جوان کو سلام پیش کرتا ہوں

ہم نے پاک فوج کو ماں کا درجہ دیا ہے،

ہم سب کی طرف سے ہر فوجی کو سلام

اس کا کارنامہ رہتی دنیا تک باقی رہے گا

میں ہر وقت کم سن شہید کو سلام پیش کرتا ہوں

جب اعتزاز کو اللہ نے اعزاز عطا کیا ہے،

میں معصوم کی شہادت کو سلام پیش کرتا ہوں،

اے علی خانان اپنے رب سے شہادت مانگو،

میں ہر شہید کے زخمی سینے کو سلام کرتا ہوں،

*****

اکلوتا شہید بھائی

مریم ارشاد

......♦♦♦......

مبین شہید، ڈاکٹر فاروق شاہ آفریدی کا اکلوتا بیٹا تھا، دو بہنوں کا اکلوتا بھائی مبین شاہ آفریدی 16 دسمبر کو اے پی ایس پشاور پر دہشت گردوں کے حملے میں شہید ہوا۔ وہ 28 ستمبر 1999 کو پشاور میں پیدا ہوا۔ وہ آرمی پبلک سکول پشاور میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ وہ قرآن پاک بھی حفظ کر رہا تھا۔ جس قرآنِ پاک سے وہ قرآن حفظ کر رہا تھا اس پر مبین نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ ’’میں مسمی مبین شاہ یہ عہد کرتا ہوں کہ آئندہ سے پانچ وقت کی نماز کو پابندی سے ادا کروں گا۔ اگر میں نے نماز ادا نہیں کی تو سزا کا مستحق ہوں گا۔ اسے مذہب سے کافی لگاؤ تھا۔‘‘

ڈاکٹر فاروق شاہ آفریدی کے لئے 16 دسمبر کا دن قیامتِ صغریٰ سے کم نہیں تھا۔ جب ان کو اطلاع ملی کہ آرمی پبلک سکول پشاور پر دہشت گردوں نے حملہ کر دیا ہے تو وہ سکول کی طرف دوڑے اور مسلسل اپنے بیٹے کو تلاش کرتے رہے۔ ان کی اہلیہ اپنی چھوٹی بیٹی کو لینے سکول گئی جو آرمی پبلک سکول جونیئر سیکشن میں تیسری جماعت کی طالبہ تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے لئے رو رہی تھی اور مس آمنہ سے کہہ رہی تھی کہ میرے بیٹے کا کچھ پتا نہیں چل رہا، دعا کریں خیریت سے ہو۔ شام کے 5 بجے مبین کا جسدِ خاکی سی ایم ایچ ہسپتال پشاور سے ملا اور 17 دسمبر کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ فاروق شاہ صاحب کا حوصلہ دیکھ کر یہ بات حقیقت لگی کہ شہید کے والدین روتے نہیں بلکہ اپنے لختِ جگر کی قربانی پر فخر کرتے ہیں۔

15 دسمبر 2014 کو مبین شہید کے سکول جاتے وقت آخری الفاظ یہ تھے کہ مما میں جا رہا ہوں اور اس کی والدہ ہمیشہ اس پر آیت الکرسی پڑھتی تھی، اس دن بھی پڑھی اور تلقین کیا کرتی تھی کہ ذکر کرتے سکول جایا کرو۔ اس دن جب وہ گلی سے سڑک کی جانب مڑا تو ماں کی طرف ہاتھ لہرایا اور مڑ کے ان کی جانب اس نے دیکھا۔ وہ سوچتی رہی روز مبین مڑ کر نہیں دیکھتا تھا، آج کیوں مڑا؟ انھیں کیا معلوم تھا کہ وہ اس دن انہیں آخری دفعہ دیکھ رہا تھا۔ والدہ اکثر مبین کو کہتی کہ جب تم حفظ کر لو گے تو میرے مرنے کے بعد بغیر قرآن پاک لئے میری قبر کے پاس بیٹھ کر زبانی سپارہ پڑھ لیا کرو گے مگر کیا خبر تھی کہ وہ پہلے چلا جائے گا۔

مبین اپنے تینوں دوستوں کے ہمراہ آڈیٹوریم کے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ یٰسین اور رفیق اس کے قریبی دوست تھے، ہر وقت اکٹھے رہتے۔ دسویں جماعت کا امتحان قریب تھا۔ مبین پوزیشن ہولڈر بچہ تھا۔ والدہ کہتی تھی ''نویں میں محنت کی، دسویں میں بھی کرو۔'' کہتا تھا: ''دسویں کے امتحان میں ایسا رزلٹ آئے گا کہ دنیا یاد رکھے گی' اور آج اسے دنیا یاد کر رہی ہے۔

بھائی، بہنوں کا مان ہوتے ہیں۔ بڑی بہن کے ساتھ بہت دوستی تھی۔ باتیں شیئر کرنا، یک زبان ہونا البتہ چھوٹی بہن کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے تھے۔ اس کے ساتھ کھیلنا، بازار کی فرمائشیں پوری کرنا، اس کی عادت تھی۔ شہادت کی رات بھی 11 بجے اس کے لئے بازار سے چیزیں لے کر آیا۔ بقول والدہ کے اس نے گھر سنبھالا ہوا تھا۔ ہر خوشی غمی میں انہیں لے کر جاتا۔ وہ ان کا دوست بھی تھا، محافظ بھی۔ شہادت سے کچھ دن قبل امی کو انٹرنیٹ سے غزہ کے شہید بچوں کی تصاویر دکھا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، ان معصوموں کا کیا قصور ہے؟ اسے کیا خبر تھی چند روز بعد وہ خود دہشت گردی کا نشانہ بنے گا۔ مبین شاہ شہید کی والدہ کا کہنا تھا کہ ان کی زندگی کے رنگ چھین لئے گے۔ مبین کی والدہ کا کہنا تھا کہ مبین کھانے میں فرائڈ قیمہ، پلاؤ، بریانی شوق سے کھاتا تھا۔ شہادت کے دن بھی وہ اس کے لئے پلاؤ بنا رہی تھیں۔ وہ کہتی ہیں کہ آج بھی جب بھی کوئی اچھی چیز بناؤں تو مبین بہت یاد آتا ہے، اس کی تمام چیزیں اس کی یاد دلاتی ہیں۔

ایک برس گزرنے والا ہے مگر زخم ابھی بھی ہرے ہیں۔ درد بھری سسکیاں ابھی بھی کانوں میں گونجتی ہیں۔آنچل ابھی بھی آنسوؤں سے نم ہے۔ماں کی گود ابھی بھی تڑپ رہی ہے، وہ دردناک مناظر ابھی بھی آنکھوں میں منجمد ہیں۔معصوم پھولوں کا بے دردی سے قتل کرنے والے دشمن کے لئے نفرت ابھی بھی موجود ہے مگر الحمدللہ وہ عزم بھی جواں ہے کہ اس ملک سے دہشت گردی کو جڑ سے ختم کریں گے۔حادثات انسان کو بہت کچھ سکھاتے ہیں۔قوموں کو زندہ کرتے ہیں،قوموں کو متحد کرتے ہیں۔ 15 دسمبر کو کئی ماؤں کی گودیں اجڑ گئیں۔اب یہ مائیں اپنے باقی بچوں کے لئے محفوظ پاکستان چاہتی ہیں۔

*****

سیاچن، گیاری اور ریڈیو پاکستان

کوثر ثمرین

.....◆◆◆.....

سیاچن کی خوبصورت چوٹیاں نہ صرف ہماری پاک فوج کے جوانوں کے حوصلوں کی طرح بلند و بالا ہیں بلکہ اتنی خوبصورت ہیں کہ چاند کی روپہلی کرنوں کی چمک سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قدرت نے ان برف پوش چوٹیوں پر دودھ کے پیالے الٹ ڈالے ہوں۔ میرے وطن کے سوہنے سجیلے جوان جن کے لئے مائیں اپنی ردائیں اٹھا کر دعاؤں کے گلاب بھیجتی ہیں، تو کہیں کسی بزرگ کی آنکھ سے ٹپکتا آنسو ان کے لئے شکرانے کا تحفہ بھیجتا ہے، جو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے سرزمین وطن کو دہشت گردی سے پاک کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔

انہی جوانوں کے بارے میں بالخصوص جنگ 65 کے شہداء اور غازیوں کے حوالے سے آج بھی لوگ کہانیاں بنتے اور سنتے ہیں تو دل میں ایک عجیب سی ولولہ انگیز امنگ جاگ اٹھتی ہے کہ کاش! ہم بھی اپنے وطن کی مٹی کا قرض چکا پائیں۔ جنگ 65 میں سرزمین وطن کی حفاظت جیسا ایمان افروز فریضہ ادا کرنے کے لئے ولولہ اور جوش جگانے میں ریڈیو پاکستان نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا کہ جب بقول ظل ہما: ''ماں نور جہاں بلیک آؤٹ کی پروا کئے بغیر ہم چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھلونے اور کھانا دے کر کہتی کہ میں وطن کی حفاظت میں اپنا حصہ ڈالنے جا رہی ہوں اگر سائرن بجے تو تم لوگ خندق میں چلے جانا۔'' جبکہ خود ملکہ ترنم نور جہاں نے خوش بخت شجاعت کو دیئے گئے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا کہ میں وطن کی مجاہدہ ہوں اور میرے یہ نغمے اپنے فوجی

جوانوں کے نام ہیں جن کی وجہ سے بعد میں ان کو ملکہ ترنم کا خطاب بھی دیا گیا۔ ملکہ ترنم نور جہاں نے خود ہی ریڈیو پاکستان کو ٹیلی فون کر کے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ بھی ملک کے ان غازیوں کے لئے اپنی آواز کا جادو جگانا چاہتی ہیں جو بزدل دشمن کے مذموم عزائم کو ناکام بنانے کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ دینے کا عہد کئے ہوئے ہیں۔

مجھے بچپن سے ہی فوجی وردی پہننے کا جنون تھا۔ میں خوابوں میں بھی اکثر دیکھتی کہ ایک منے سے فوجی طیارے میں بیٹھی اپنے ملک کے دشمنوں پر گولیاں برسا رہی ہوں۔ مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ جب ریڈیو پاکستان اسلام آباد سے آئی ایس پی آر کے تعاون سے پہلا پروگرام ''ہمارے جوانوں کے نام'' شروع کیا گیا تو سٹیشن ڈائریکٹر فخر عالم نعمانی نے شاید میری بچپن سے ہی فوجی وردی پہننے کی خواہش کو بھانپ لیا تھا اور مجھے بحیثیت پروڈیوسر اور کمپیئر کے اس پروگرام کی ذمہ داری سونپی جس میں میرے ساتھی کمپیئر ناصر کاظمی بڑی محنت سے سکرپٹ تیار کیا کرتے تھے۔ پورے پاکستان کے فوجی جوانوں کے لئے بہت محبت بھری دعائیں اور پیغامات بذریعہ خطوط، ای میل اور ٹیلی فون موصول ہوتے تھے لیکن نہ جانے سیاچن میں کیا کشش تھی کی سب سے زیادہ دعائیں ان ہی جوانوں کے نام ہوتی تھیں جو برف پوش چٹانوں پہ دشمن اور موسم دونوں کی سازشوں کا مقابلہ کرتے۔ یہ ہمارے وہ جوان تھے جن کے پاس ٹی وی یا اخبارت کے توسط سے معلومات کا کوئی فوری ذریعہ نہیں تھا ایسے میں ایک چھوٹا سا ریڈیو سیٹ ان کا بہت بڑا ساتھی تھا۔ جب میں یخ بستہ ہواؤں میں بیٹھے ہوئے ان جوانوں کو مخاطب کرتی تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میں خود بھی ایک اگلو میں بیٹھی ہوں۔ یہی وجہ تھی ہم نے اپنے سٹوڈیو کا نام بھی اگلو رکھ دیا تھا۔ رات کو 9 سے 10 بجے تک پروگرام ''ہمارے جوانوں کے نام'' اور پھر 11 سے 12 کے درمیان'' جاگتا پاکستان'' میں اپنے فوجی جوانوں کے لئے صرف میں ہی ریڈیو پاکستان کی آواز کا دیا روشن نہیں کرتی تھی بلکہ پوری قوم ان کے لئے دعاؤں کے دیے جلاتی۔ اس پروگرام میں جہلم سے مومی گل فوجی جوانوں کے لئے اتنے لمبے لمبے خطوط لکھتی جنہیں ہمیں ریڈیو کے طویل کوریڈور میں بچھا

کر پڑھنا پڑتا۔کبھی صائمہ خان مومی کاغذ پر خشک میوہ جات چپکا چپکا کر خط فریم کر کے بھیجتی تو کبھی ایبٹ آباد سے سیاچن میں ڈیوٹی پر موجود کسی کیپٹن کی منگیتر محبت بھرے پیغامات نشر کرنے کی درخواست کرتی۔

جب کوئی ماں سرحدوں کے کسی محافظ کو ٹیلی فون کے ذریعے اپنی محبت، حوصلے اور وطن کے لئے جان کی بازی لگانے کی تاکید کرتی تو میرے تاثرات بھی ساتھ ساتھ بدلتے جاتے۔ایسے میں سیاچن سے کسی فوجی جوان کی آواز ہوا کے دوش پر ہمارے اور سامعین کے کانوں سے ٹکراتی تو اس وقت ہمارے اندر جوش اور ولولے کی کیفیت ہی کچھ اور ہوتی لیکن اگلے ہی ہفتے کسی فوجی جوان کے خط میں یہ لکھا ہوتا کہ پچھلے دنوں ہم جن چار جوانوں نے مل کر آپ سے ایک نغمے کی فرمائش کی تھی ان میں سے ایک شہید ہوگیا تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ مجھے یاد ہے نریندر سنگھ گریوال کے سرحد پار سے آنے والے رومن میں لکھے ہوئے خطوں میں جہاں میڈیم نور جہاں کے پنجابی نغموں کی فرمائش ہوتی، وہیں یہ بھی لکھا ہوتا کہ پاکستان آرمی ازنائیگر آف ایشیا تو میرا سر فخر سے تن جاتا کہ ہماری فوج کی بہادری کے دشمن ملک کے رہنے والے بھی معترف ہیں۔ پھر یوں ہوا کہ پروموشن کے ساتھ میرا ٹرانسفر پشاور سے راولپنڈی اور پھر ڈیپوٹیشن پر وزارت بہبود آبادی سمیت آواز کی دنیا کے مختلف شعبوں ہوتا چلا گیا لیکن اس دوران میں نے اپنے اندر کے فوجی کے حوصلے ہمیشہ بلند رکھے۔نومبر 2014 میں جب ریڈیو پاکستان کی سابق ڈائریکٹر جنرل محترمہ ثمینہ پرویز نے ریڈیو پاکستان سکردو کے دورے کے بعد سابق ڈائریکٹر پروگرامز محترمہ نئیر جمال کے ذریعے میرے ریڈیو پاکستان سکردو میں تعیناتی کے احکامات صادر فرمائے تو مجھے یوں لگا جیسے میرا دنیا کے بلندترین محاذ سیاچن سے بلاوا آگیا ہے۔میں نے ایک فوجی جوان کی طرح احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے فوری رختِ سفر باندھا تو لوگوں نے مجھے کہا کہ اس سرد موسم میں کس سردترین علاقے میں جارہی ہو جہاں مرد حضرات بھی جانے سے گریز کرتے ہیں۔ میں نے کہا یہ تو سکردو ہے، اس سے بھی بلندترین برفیلی فضاؤں میں ہمارے سیاچن کے جوان

بیٹھے ہیں، میں بھی اپنا اگلوا سلام آباد سے سکردو میں شفٹ کر رہی ہوں۔ ریڈیو پاکستان سکردو میں بحیثیت سٹیشن ڈائریکٹر جہاں میں نے دوسرے پروگراموں پر توجہ دی، وہاں میری اولین ترجیح فوجی جوانوں کا پروگرام تھا جو ہفتے میں صرف دو دن نشر ہوتا تھا۔

مجھے ایک دھچکا سا لگا جب میں نے اس علاقے کی نظریاتی، جغرافیائی اور ثقافتی سرحدوں کی اہمیت پر غور کیا۔ یہ ساتھ ہی تو دشمن نے بندوقیں تان رکھی ہیں۔ سرحدوں کے پار ہماری آواز ایسی قوت اور توانائی سے جانی چاہئے کہ دشمنوں کے کلیجے دہل جائیں۔ میں نے فوری طور پر اپنے ہیڈ کوارٹر سے اجازت مانگی اور فوری طور پر ''پاسبان'' کے نام سے فوجی جوانوں کے ایک پروگرام کا شیڈول مرتب کیا جسے ہیڈ کوارٹرز نے بہت سراہا کیونکہ ملک میں بڑھتی ہوئی دہشت گردی کی روک تھام، امن کے فروغ اور ملک کے استحکام کے لئے اس علاقے میں پاک فوج کے حوصلوں کو مزید بلند کرنے کے لئے یہاں سے ایسے پروگراموں کی ضرورت ہی تو تھی۔

16 دسمبر کو آرمی پبلک سکول پشاور میں دل دہلانے والے سانحے کی افسوس ناک خبر سن کر میں اپنے والد کی برسی کا غم بھلا کر سٹوڈیو کی طرف روانہ ہوئی تو یہاں سکردو کے ڈپٹی کمشنر جناب عابد علی، پریس کلب سکردو کے صدر محمد حسین آزاد، صحافیوں، دانشوروں، شاعروں، ادیبوں اور شہریوں کی ایک کثیر تعداد نے اس طرح سے ہمارا ساتھ دیا کہ بقول کچھ لوگوں کے ہم نے سٹوڈیو کے در و دیوار کو روتے ہوئے محسوس کیا۔ اس خصوصی ٹرانسمیشن نے میرے حوصلوں کو اور بلند کیا اور یوں ریڈیو پاکستان سکردو سے پروگرام ''پاسبان'' پوری آب و تاب سے نشر ہونے لگا۔ اس پروگرام میں سامعین کی کثیر تعداد خطوط اور فون کالز کے ذریعے شامل ہونے لگی۔ اسی اثنا میں ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان سید محمد عمران گردیزی نے www.radio.gov.pk کے ذریعے جب ایف ایم 93 ریڈیو پاکستان سکردو کو بھی انٹرنیٹ سے منسلک کر دیا تو لائیو سٹریمنگ کے ذریعے ہماری نشریات کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔ پاک فوج کے امن کے فروغ میں مثالی کردار کے حوالے سے لوگوں کے پیغامات بھی بڑھتے چلے گئے اور فون کالز میں جنرل راحیل شریف کی دہشت گردی کے

خلاف جنگ کے حوالے سے ہر اقدام کو سراہا جانے لگا اور ان کے عزم و استقامت کی مقبولیت کے حوالے سے عوام کی رائے واضح تر ہوتی چلی گئی۔ جہاں بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کی کثیر تعداد نے پاک فوج کے نام پیغامات بھیجنے شروع کئے وہیں سرحد پار سے نیتو سنگھ اور انیل کمار سمیت بے شمار لوگ ہمارے سامعین میں شامل ہو گئے۔

5 ستمبر 2015 کو جب پاک فوج نے گیاری میں شہداء کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے خصوصی تقریب کا اہتمام کیا جس میں شہداء کے لواحقین کو خصوصی طور پر مدعو کیا تو مجھے ریڈیو پاکستان کے نیوز انچارج بہادر علی سالک کے توسط سے معلوم ہوا کہ ریڈیو پاکستان کی ٹیم بھی وہاں پر جا سکتی ہے تو میری خوشی قابل دید تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ایک فوجی جوان اپنے دوسرے ساتھیوں سے ملنے ان کی پوسٹ پر جا رہا ہے۔ جب گیاری کے لئے روانہ ہوئی تو میں سوچ رہی تھی یہی وہ برف پوش چٹانیں ہیں جن کو سوچ کر میں سٹوڈیو کو اگلو تصور کیا کرتی تھی۔ اب حقیقت میں انہیں دیکھوں گی تو میری کیا کیفیت ہوگی۔ یہ سوچتے سوچتے ہم جہلو پہنچے۔

میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت تصور کر رہی تھی۔ جب صبح ساڑھے چھ بجے کیپٹن حارث کی رہنمائی میں ہم آرمی کی گاڑی میں گیاری سیکٹر روانہ ہوئے تو میڈیا کے چند دیگر ساتھی بھی ساتھ تھے مگر خاتون میں اکیلی ہی تھی۔ میں نے گاڑی میں غور سے دیکھا تو مجھے سکیورٹی گارڈ جو گیاری سے نزدیک اس آخری گاؤں سے تعلق رکھتا تھا، جس کے بعد سرحدیں شروع ہو جاتی ہیں کا، جملہ یاد آیا۔ اس نے ہماری روانگی کے وقت اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا تھا: ''میڈم صاحبہ غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ ریڈیو پاکستان کی ٹیم گیاری سیکٹر تک جا رہی ہے۔ میرے فوجی جوانوں کو میرا اسلام کہنا۔'' فاصلے سمٹتے گئے اور میں جس جیپ میں سوار تھی وہ خطرناک راستوں کے پیچ و خم، لکڑی کے بنے ہوئے پلوں اور ندی نالوں کو عبور کرتے ہوئے گیاری جا پہنچی۔

سکردو سے جن بے گیاہ پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا، وہی یہاں تک جاری تھا۔ البتہ ان پر جمی برف، سرمئی اور سفید گلیشئرز کے درمیان وہ قاتل گلیشئر بھی سامنے تھا جس نے لینڈ

سلائڈ نگ کے ذریعے گیاری کے بہادر جوانوں کو درجہ شہادت پر فائز کر کے ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔عین اس مقام پر جہاں جوان شہید ہوئے تھے،ایک سٹیج کو شہدائے گیاری کی تصویروں سے سجایا گیا تھا۔ بینا فلیکس کے ذریعے شہداء کے پیغام کو اجاگر کرنے کے لئے اثر انگیز شعر لکھے تھے۔شہدائے گیاری کی تصویروں کے ساتھ لکھا تھا،''ہم تم کو نہیں بھولے۔'' دائیں طرف سٹینڈ پر آویزاں ایک تصویر میں میجر ذکا شہید اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے نظر آرہے تھے۔جنوبی پنجاب سے تعلق رکھنے والے اس شہید کا جسم برف میں مدفون دیگر جوانوں میں سے سب سے آخر میں نکالا گیا اور وہاں موجود اس کے ساتھیوں نے مجھے بتایا کہ جس وقت میجر ذکا کو گلیشئر کے نیچے سے تلاش کیا گیا تو ایک ماہ کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی ان کا جسم بہت تر و تازہ نکلا (میں یہاں ''جسم'' کا لفظ استعمال کر رہی ہوں کیونکہ شہید زندہ ہوتا ہے) مجھے اس وقت اور بھی حیرت ہوئی جب مختلف جوانوں نے بتایا کہ آج بھی پہاڑوں سے اسی جگہ سے ہمیں ہمارے شہید ساتھیوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے کہ ہم یہاں بہت خوش ہیں۔

میری ان جوانوں کے حوالے سے ان کے مختلف ساتھیوں سے گفتگو ہوئی تو مجھے یہ جان کے اور بھی حیرت ہوئی کہ یہ شہید گیاری کے دشوار گزار راستوں پر اور مشکل ترین محاذ پر اپنے دوسرے ساتھیوں کی حفاظت کے لئے روشنی کے چراغ لئے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ان کا کہنا تھا کہ جہاں ہم رکتے ہیں تو چند قدم پیچھے چلنے والے یہ روشن لوگ بھی رک جاتے ہیں۔یہ بات ایک نہیں مختلف مقامات پر کئی جوانوں سے میں نے سنی تو میرا یقین اور پختہ ہو گیا کہ اللہ رب العزت کا یہ فرمان عین درست ہے کہ ''شہید زندہ ہوتے ہیں اور انہیں مردہ نہ کہو تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے اور انہیں اللہ کی طرف سے رزق بھی عطا ہوتا ہے۔'' ریڈیو پاکستان کے لئے بھرپور رپورٹ تیار کرتے ہوئے میں نے گیاری کی تقریب کے چشم دید مناظر کو بالخصوص مدنظر رکھا۔اس تقریب میں خاص طور پر عبداللہ صاحب کو مہمان خصوصی رکھا گیا تھا جو نہ صرف ایک شہید کے والد تھے بلکہ انہوں نے اپنا دوسرا بیٹا بھی پاک فوج کے لئے وقف کر رکھا تھا۔تقریب میں پاک فوج کے

افسران کی کثیر تعداد موجود تھی۔ سکیورٹی کے انتظامات انتہائی سخت تھے۔ تقریب میں شامل شہداء کے لواحقین سے گفتگو کے دوران مجھے ایک پاکستانی ہونے پر فخر محسوس ہوا کیونکہ ان سب کی آنکھوں میں ایک ایسا فخر تھا جو صرف ایک شہید کے خاندان کے افراد کو ہی قدرت کی طرف سے ودیعت کیا جا سکتا ہے۔

کارگل کے محاذ پر شہید ہونے والے نائیک عبدالقادر کے بھائی محمد عارف بلغاری نے کہا کہ ہمارے پورے خاندان کے لئے یہ فخر کی بات ہے کہ ہمارا تعلق ایک ایسے ملک سے ہے جہاں شہادت کو مقصد حیات سمجھا جاتا ہے۔ میرے بھائی نے نہ صرف ملک اور قوم کا وقار بلند کیا ہے بلکہ اس کی وجہ سے ہمارے خاندان کو بھی بہت عزت و تکریم ملی ہے۔ لانس نائیک غلام محمد شہید کے صاحبزادے ندیم نے کہا کہ میری رگوں میں ایک بہادر فوجی کا خون دوڑ رہا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں بھی اپنے والد کی طرح پاک فوج میں خدمات انجام دوں اور اپنے ملک پر قربان ہو جاں۔ چھور بٹ سے تشریف لانے والی طالبہ صائمہ نے بتایا کہ ان کے چچا 1999 میں شہید ہوئے، میرا دل چاہتا ہے کہ میں آرمی جوائن کروں کیونکہ آرمی دہشت گردی کے خلاف جو اقدامات کر رہی ہے، اس سے بڑھ کے خوبصورت جہاد کوئی نہیں۔ سید محمد شہید کے صاحبزادے ساجد حسین نے کہا کہ میرے والد شہید ہو گئے اور اس طرح وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو گئے۔ میں جنرل راحیل شریف کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے شہداء کے خاندان کو ہمیشہ اولین فوقیت دی اور پاک فوج کا شکریہ کہ انہوں نے گیاری سیکٹر میں یہ تقریب منعقد کی۔ اس موقع پر جنگ 65 اور 71 میں کارنامے انجام دینے والے جنگی ہیرو صوبیدار محمد علی نے اپنے تاثرات ریکارڈ کراتے ہوئے کہا کہ پاک فوج میں شمولیت میرے لئے ہمیشہ اعزاز کی بات رہے گی۔ دشمن ملک کے سپاہیوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے کہ ان میں سے کتنے ہی خودکشی کر چکے ہیں لیکن پاکستانی سپاہی ہمیشہ شہادت کی موت پر یقین رکھتا ہے۔ اس کے لئے دونوں ہی مرتبے اہم ہیں۔ اگر شہید ہو گئے تو سرخرو اور زندہ رہے تو غازی۔ ایک شہید کی والدہ نے جب اپنے شہید بیٹے کی شہادت پر اللہ کا شکر

ادا کیا تو اس کی آنکھوں میں عزم و استقامت کی وہ روشنی تھی کہ اگر خدا ان کو مزید بیٹوں سے نوازتا تو انہیں اپنے وطن پر قربان ہونے کی تاکید کرتیں۔

ان سب روح پرور تاثرات کو ریکارڈ کرتے ہوئے مجھے فوجی جوانوں کے پروگرام میں سرحد پار کے ایک فوجی کی ای میل یاد آئی جس نے لکھا تھا کہ ہماری فوج ہمیں ایسے کام کرنے پر مجبور کرتی ہے جس کی وجہ سے میں ذہنی مریض بن چکا ہوں، ہوسکتا ہے میں خودکشی کرلوں، اگر میں مرجاؤں تو میری خواہش ہوگی کہ میرا اگلا جنم پاکستان میں ہو۔

*****

ٹائیگرز آف کے کے اچ

لیفٹیننٹ کرنل عارف محمود

.....◆◆◆.....

یہ وہ لمحہ تھا جب پانی مجھ پر غالب آ چکا تھا۔اب میں نے گھپ اندھیرے میں ایک آخری کوشش کے طور پر پھنسے ہوئے دروازے کی سمت ہاتھ بڑھا کر زور لگایا۔میرا تھوڑا سا بازو جیسے دروازے کے معمولی سے خلا میں اٹک گیا۔میرے کانوں میں پانی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔دروازے کا خلا بالکل ہی ناکافی تھا اور مجھے اس کا ادراک تھا۔بس اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ گہرے اندھیرے اور یخ بستہ پانی میں میری سانسیں اب جواب دے رہی تھیں۔ میں نے جدوجہد ترک کردی۔سانس لینے کی توانائی بھی ختم ہوگئی تھے۔میں موت کا انتظار کرنے لگا۔ چند ہی ثانیوں میں مجھے احساس ہوا کہ زندگی اتنی آسانی سے نہیں چھوڑی جاسکتی۔میں نے آخری بار ایک بھرپور کوشش کرنے کا سوچا اور خود کو دروازے کے معمولی سے خلا کی طرف دھکیلنے لگا۔

منصۂ شہود پر جلوہ افروز ہوتے ہی ہدف کے تعاقب میں ایک آفیسر، تین جونیئر کمیشنڈ آفیسرز اور 32 جوانوں کی شہادت کا نذرانہ پیش کرنے والی کور آف انجینئرز کی یونٹ ''ٹائیگرز آف کے کے اچ'' آج ایک نئے سفر پر روانہ ہوچکی تھی۔ پنوں عاقل سے کھاریاں کی طرف عازمِ سفر ہوتے ہوئے ہر آفیسر، جے سی او اور سولجر کا جوش و ولولہ دیدنی تھا۔کھاریاں میں انہیں دراصل ایک ایسے ڈویژن کا حصہ بننا تھا جو پہلے ہی سوات میں انسانیت کی خدمت میں پیش پیش اور

دہشت گردوں کے لئے پیغامِ اجل تھا۔ دراصل ٹائیگرز آف کے کے ایچ کی روایات اور تاریخ بھی قربانیوں اور خدمتِ ملک وملت سے بھری پڑی تھی۔ 48 برس قبل 15 مارچ 1966 کو جب یہ بٹالین روڈ کنسٹرکشن بٹالین کے نام سے رسالپور میں معرضِ وجود میں آئی تو اس نے اپنے پہلے مشن میں ہی 'کومیل' سے 'چلاس' تک ایک دشوار گزار اور پرخطر پہاڑی سلسلے کا سینہ چیر کر شاہراہِ قراقرم کے مشکل ترین حصے کی تعمیر کا سہرا اپنے سر باندھا۔ اس مشن کی تکمیل میں اِسے آفیسرز اور جوانوں کی انمول جانیں بھی نچھاور کرنا پڑیں۔

2015 کے آغاز میں پنوں عاقل میں یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل عامر جدون (شہید) کو جب یونٹ کے اگلے سٹیشن کھاریاں اور پھر سوات میں تعیناتی کا پتہ چلا تو انہوں نے اس خبر کو اپنی سپاہ تک پہنچانے کا حکم دیا۔ اِن کی توقع کے عین مطابق یہ نوید 'ٹائیگرز آف کے کے ایچ' کے لئے مژدہ جان فزا سے کم نہ تھی۔ انہوں نے یہ خبر قبل از وقت اس لئے عام کی تھی کہ پنوں عاقل اور مضافات کی گرمی اور لو سے ستائے ہوئے جوانوں کے چہروں پر کچھ رونق آجائے۔ وہ دراصل اپنے سولجرز کے دلوں پر راج کرتے تھے اور ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور دکھ درد کی پروا کرتے تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل عامر جدون کا تعلق ایک فوجی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد بھی ایک لیفٹیننٹ کرنل تھے اور 1965 اور 1971 کی جنگوں میں حصہ لے چکے تھے۔ جبکہ دو بھائی تا حال پاک فوج میں ہیں اور ایک بھائی پاکستان فضائیہ میں خدمات انجام دے رہا ہے۔ گزشتہ ایک سال کے دوران والدین کے یکے بعد دیگرے اس جہانِ فانی کو الوداع کہنے کے بعد لیفٹیننٹ کرنل عامر جدون کی شخصیت میں ایک بڑی تبدیلی آئی تھی۔ ان میں اب نہ صرف اپنے اہلِ خانہ اور بہن بھائیوں کے لئے ایک مخصوص شفقتِ پدری اور احساسِ ذمہ داری میں اضافہ ہوا تھا بلکہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں اور زیرِ کمان سپاہ کے ساتھ ایک خاص جذباتی لگاؤ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ وہ جب یونٹ میں ہوتے تو اپنی اہلیہ سمیت جوانوں کی چھوٹی چھوٹی ضروریات اور مسائل کے بارے میں فکرمند رہتے اور حل کرتے۔

پنوں عاقل سے روانہ ہوتے ہوئے جنرل آفیسر کمانڈنگ عارف حسین وڑائچ نے نہ صرف یونٹ کے پانچ سالہ قیام کو سراہا بلکہ اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر انتظامی طور پر ضروری نہ ہوتا تو وہ اس یونٹ کو ہمیشہ اپنے ہی زیرِ کمان رکھنا پسند کرتے ۔جی او سی میجر جنرل عارف حسین وڑائچ نے یونٹ کی پنوں عاقل سے روانگی سے قبل اپنے خطاب میں ٹائیگرز آف کے کے ایچ کے کارناموں کو دہراتے ہوئے بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا۔

اسی دوران یونٹ کی کھاریاں روانگی کی تیاریاں زوروں پر تھیں ۔یونٹ کے سبھی آفیسرز، جونیئر کمیشنڈ آفیسرز اور سولجرز بڑھ چڑھ کر روانگی کے معاملات نبھانے میں مصروف تھے ۔یونٹ کے خصوصی امور کے ماہر کمانڈنگ آفیسر کے دستِ راست صوبیدار میجر محمد اسلام خان (شہید) کوہاٹ کے رہنے والے ایک منجھے ہوئے ایس ایم تھے جو 27 اکتوبر 1981 سے انجینئر کور میں خدمات انجام دے رہے تھے ۔یونٹ میں ان کا 33 سالہ سفر بطور ایک مثالی سولجر اور حلیم و بردبار انسان، ہر سینئر اور جونیئر کی زبان پر تھا ۔جبکہ آفیسرز کی ٹیم میں میجر محمد عادل شریف (شہید) منڈی بہاالدین کے رہنے والے اور وانا (وزیرستان) کے غازی تھے ۔جہاں انہوں نے تین سال تک دہشت گردوں کی سرکوبی میں شجاعت کی ایک سنہری تاریخ رقم کی تھی ۔میجر عادل 16 فروری 1987 کو ضلع منڈی بہاؤالدین کے ایک گاؤں چک نمبر 25 میں پیدا ہوئے تھے ۔3 سال کی عمر میں والدین کے ساتھ لاہور منتقل ہو گئے ۔ابتدائی تعلیم گورنمنٹ سنٹرل ماڈل سکول لوئر مال لاہور سے حاصل کی ۔جبکہ 2004 میں گورنمنٹ کالج آف سائنس سے ایف ایس سی (پری انجینئرنگ) کیا اور یو ای ٹی لاہور میں کمپیوٹر سائنس انجینئرنگ میں داخلہ لے لیا۔ابھی وہ پہلے سمسٹر میں ہی تھے کہ منتخب ہو کر مئی 2005 میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول چلے گئے ۔15 اپریل 2007 کو کمیشن حاصل کرتے ہی وزیرستان میں تعینات ہوئے ۔ 3 سال بعد وانا (وزیرستان) سے بطور ایک غازی کے سرخرو لوٹے ۔اس کے بعد ان کو ٹائیگر آف کے کے ایچ میں خدمات کا موقع ملا تھا ۔اس دوران انہوں نے رسالپور جا کر اپنی 4 سالہ ڈگری بھی مکمل کی

اوراس طرح ایک تجربہ کار اور کوالیفائیڈ فیلڈ آفیسر کے طور پر 'ٹائیگر آف کے کے ایچ' کی ٹیم کا حصہ بنے۔

کرنل عامر کی ٹیم کے ایک اور رکن کیپٹن کاشف ارشاد گورایہ (شہید) بھی پیدائشی فوجی تھے۔ان کے والد میجر (ریٹائرڈ) ارشاد علی گورایہ ایک منجھے ہوئے توپچی تھے اور بھائی میجر عامر گورایہ تا حال پاک فوج میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔14 جنوری 1988 کو کوہاٹ میں پیدا ہونے والے کیپٹن کاشف (شہید) نے 2010 میں رسالپور سے بطور سول انجینئر اپنی تعلیم مکمل کی اور بطور کیپٹن پاک فوج میں کمیشن حاصل کیا۔'ٹائیگرز آف کے کے ایچ' میں کیپٹن کاشف ارشاد ایک ملنسار اور محنتی آفیسر کے طور پر جانے جاتے تھے۔پنوں عاقل سے کھاریاں کی طرف عازمِ سفر ہونے والی ریل گاڑی پر سوار ایک اور نوجوان لیفٹیننٹ محمد عباس (شہید) بھی ایک فوجی گھرانے کے آفیسر تھے جو بچپن سے ہی شہادت کی دعائیں کیا کرتے۔دراصل ان کے خالہ زاد بھائی کیپٹن نصر اللہ شہید پہلے ہی سیاچن میں جامِ شہادت نوش کر چکے تھے اور ان کی تصویر دیکھ دیکھ کر لیفٹیننٹ محمد عباس کا شوقِ شہادت پروان چڑھتا رہتا تھا۔لیفٹیننٹ عباس کا تعلق ضلع خوشاب کے موضع مردوال سے تھا اور انہوں نے 19 اکتوبر 2014 کو ٹائیگرز آف کے کے ایچ میں کمیشن حاصل کیا۔یہ یونٹ ان کے والد نائب صوبیدار (ریٹائرڈ) اختر حسین کی تھی۔ان کے دوسرے بھائی میجر طارق بھی پہلے ہی پاک فوج میں خدمات انجام دے رہے تھے۔جبکہ ایک اور بھائی آرمی میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کر رہے تھے۔یہ ایک دینی گھرانہ تھا، اس لئے لیفٹیننٹ عباس بھی اکثر ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔

اس قافلے کی تیاریوں کے روحِ رواں لیفٹیننٹ مدثر حسن بطور کوارٹر ماسٹر فرائض انجام دے رہے تھے جبکہ لیفٹیننٹ سید کاشف حسین شاہ کاظمی کے پاس ایک کمپنی کی کمان تھی۔بھرپور تیاریوں اور الوداعی تقریبات کے بعد پوری بٹالین ریل پر سوار ہوئی تو سولجرز میں سے 29 جوانوں اور جے سی اوز کے اہلِ خانہ کو بھی خصوصی بوگی میں جگہ دی گئی۔کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ

کرنل عامر جدون کی اہلیہ نے جب دیکھا کہ بٹالین کے سولجرز کی بیویاں اور بچے اسی ٹرین پر سفر کر رہے ہیں تو انہوں نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ بچوں سمیت ان کی ہم سفر بنیں گی۔ یہ کوئی معمولی فیصلہ نہ تھا۔ ان کی اپنی کار جس میں ائیر کنڈیشن کی سہولت بھی میسر تھی، وہ بھی بذریعہ سڑک کھاریاں جا رہی تھی اور بڑے آرام سے اس میں سفر کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اپنے اسلاف کی روایات کی پاسدار تہمینہ جدون (شہید) کا فیصلہ ان کی قائدانہ فہم وفراست اور ایثار کا آئینہ دار تھا۔ وہ اپنے پھول جیسے نازک بچوں سمیت شدید گرمی میں اپنے سولجرز کے ہمراہ ٹرین پر عازم سفر ہوئیں۔ دس سالہ معصوم سیف اللہ جدون (شہید) اور جان سے پیاری پانچ سالہ بیٹی فاطمہ جدون (شہید) بھی ان کے ہمراہ تھی۔ کمانڈنگ آفیسر کی اہلیہ دراصل اپنے سولجرز کی فیملیز کو بھی اپنے بچوں کی طرح ہی سمجھتی تھیں۔ وہ باقاعدگی سے ان سے ملاقاتیں کرتیں، ان کے حال واحوال پوچھتیں اور حتی الوسع ان کے مسائل کو حل کرانے کی سعی کرتیں۔

ٹرین میں مسافروں کے لئے چھ بوگیاں تھیں جبکہ 21 ویگنیں سامان والی تھیں۔ انجن کے فوراً پیچھے آفیسرز کا سلیپر تھا جس میں چھ کیبن بنے ہوئے تھے، ان میں سے آگے سے پہلا کیبن صوبیدار میجر اسلام کو دیا گیا تھا جبکہ دوسرے میں کیپٹن کاشف اور لیفٹیننٹ کاشف کاظمی سوار تھے۔ تیسرے کیبن میں لیفٹیننٹ سید عباس اور چوتھا کیبن بطور آفیسرز میس یا کامن روم خالی رکھا گیا تھا۔ پانچویں کیبن میں میجر عادل شریف اور لیفٹیننٹ مدثر حسن تھے۔ چھٹا کیبن کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل عامر جدون اور ان کی فیملی کے پاس تھا۔ یونٹ کے انتظامی امور کے انچارج لیفٹیننٹ مدثر نے کمانڈنگ آفیسر کے کیبن کو آرام دہ بنانے کی اپنی سی کوشش کی۔ سیٹوں پر صاف ستھری چادریں اور تکیے رکھوائے اور بچوں کے لئے ہلکی پھلکی اشیائے خوردونوش کا اہتمام کیا۔

یہ بچے دراصل یونٹ کے سبھی افسروں کی آنکھ کا تارا تھے۔ ننھی فاطمہ جدون اکثر اپنے پاپا کی یونیفارم پہن لیتی تو یوں لگتا جیسے کسی کیموفلاج مورچے میں بیٹھی ہو اور کبھی وہ بابا کی نیلی ٹوپی اور چھڑی اٹھا کر اپنے بھائی سیف اللہ جدون کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتی دکھائی دیتی۔ لیفٹیننٹ مدثر

بتاتے ہیں کہ ان بچوں کو بطخوں اور خرگوشوں سے کھیلنے میں بڑا مزا آتا۔ اگلا کیبن لیفٹیننٹ مدثر حسن کا تھا جو یونٹ کے کوارٹر ماسٹر (انتظامی امور کے ذمہ دار) اور پہلے دن کے لئے ٹرین کے ڈیوٹی آفیسر بھی تھے۔ بے شمار انتظامی و انضباطی امور کے بعد بالآخر ٹرین پنوں عاقل سے روانہ ہوئی۔ یکم جولائی کی سحر 3 بجے کا وقت تھا جب سانگی سٹیشن کے پاس ایک پڑاؤ کے بعد گاڑی روانہ ہوئی۔

گرمی اپنے جوبن پر تھی۔ روزے داروں نے اندھیرے میں جیسے تیسے اپنی سحری کھائی اور روزہ رکھ لیا۔ اگلی صبح ایک بجے گاڑی سمہ سٹہ پہنچی تو میجر عادل اور لیفٹیننٹ کاشف کاظمی سٹیشن ماسٹر اور مکینک کی تلاش میں نکلے۔ مکینک نے جنریٹر کے کچھ پرزے نئے لینے کا مطالبہ کیا تو یونٹ نے نئے پرزے بھی مہیا کر دیئے لیکن ٹرین میں بجلی آنی تھی نہ آئی۔ البتہ جب گاڑی وسطی پنجاب میں داخل ہوئی تو بارانِ رحمت برس پڑی اور موسم کافی خوشگوار ہو گیا۔ پروگرام کے مطابق گاڑی کو رات 11 بجے تک فیصل آباد پہنچ جانا چاہئے تھا لیکن غیر ضروری تاخیر اور سست روی کے باعث یہ خصوصی ملٹری ٹرین رات 3-2 بجے کے درمیان فیصل آباد پہنچی۔ 2 جولائی کی صبح یہ ریل بستی حافظ آباد میں مختصر سے قیام کے بعد ایک بار پھر روانہ ہوئی۔ یہ کوئی ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ ٹرین نے ایک اور گاڑی کو کراسنگ دی اور تقریباً 40 سے 45 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے فراٹے بھرنے لگی۔

اگلے چند گھنٹوں میں گاڑی نے کھاریاں کے پاس ہونا تھا۔ مسلسل کئی دن اور راتوں کے جاگے ہوئے آفیسرز اپنے اگلے سٹیشن پر موجود استقبالیہ یونٹ کے آفیسرز سے رابطے میں تھے، مسلسل رت جگوں، گرمی اور تھکاوٹ کے ستائے آفیسرز یہاں تک یقین دہانی کرواتے کہ انہیں کھاریاں پہنچنے پر "اچھا سا ٹھنڈی مشین والا" کمرا ہی مل رہا ہے نا؟ تاکہ وہ جی بھر کر سو سکیں۔ یکا یک کھڑکی سے باہر دھول کا ایک غیر معمولی جھونکا محسوس ہوا۔ سامنے بیٹھے ہوئے لیفٹیننٹ عباس نے تجویز کیا کہ مٹی سے بچنے کے لئے کھڑکی بند کر دیتے ہیں لیکن لیفٹیننٹ مدثر نے کہا کہ یہ مٹی اندر

تو آ نہیں رہی اس لئے کھڑکی بند کرنے کی ضرورت نہیں۔ دوسرے ہی لمحے مٹی اور دھول کا یہ جھونکا طوفان کے ایک زور آور بگولے کی طرح کیبن کے اندر پہنچ گیا اور آناً فاناً ٹرین کے آہنی پہیوں اور پٹڑی کے مابین رگڑ کی ایک خوفناک چیخ سنائی دی جیسے ریل گاڑی کو روکنے کے لئے بریکوں کو پوری قوت سے استعمال کیا جا رہا ہو، ساتھ ہی ایک جھٹکا لگا جس نے انسان اور سامان بلا امتیاز ہر کیبن میں اِدھر سے اُدھر پٹخ دیئے۔

نوجوان آفیسر لیفٹیننٹ محمد عباس جو ہر وقت ذِکرِ الٰہی میں مصروف رہنے کے حوالے سے جانے جاتے تھے بآواز بلند کلمہ طیبہ کا وِرد کرنے لگے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ریل گاڑی کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔ اب کیبن کی ہر چیز جیسے چھت کی طرف اڑنے لگی اور ساتھ ہی ٹرین ایک زور دار جھٹکے سے ساکت ہوگئی۔ لیفٹیننٹ مدثر اس جھٹکے سے شاید نیم بے ہوشی میں چلے گئے تھے۔ لیفٹیننٹ مدثر کو اس منظر کے بعد اگلا احساس ایک ٹھنڈے پانی کے چھونے کا ہوا۔ پانی تیزی سے کیبن میں بھرنے لگا تھا جو اِن کے لاشعور نے اِنہیں محسوس کرا دیا۔ ''ہمیں فوراً اس پانی سے باہر نکلنا ہوگا۔'' مدثر نے سوچا اور جلدی سے لیفٹیننٹ عباس کو کندھے سے پکڑ کر کیبن کے سامنے والی گیلری کی طرف بڑھنے لگے۔ فرش اب غیر ہموار اور ٹوٹا ہوا تھا اور نقل و حرکت آسان نہ تھی۔

لیفٹیننٹ کرنل عامر جدون کے بچوں کی چیخ و پکار لیفٹیننٹ مدثر کے کانوں میں واضح سنائی دے رہی تھی۔ قریب سے ہی میجر عادل شریف اور کیپٹن کاشف گورایہ تیزی سے گزرتے دِکھائی دیئے۔ کیپٹن کاشف چیخ چیخ کر سب کو باہر نکلنے کے لئے کہہ رہے تھے۔ خود دونوں آفیسرز جلدی سے آگے بڑھے اور اپنے کمانڈنگ آفیسر کے کیبن کو کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ دروازہ بری طرح پھنس چکا تھا۔ لیفٹیننٹ مدثر بھی کمانڈنگ آفیسر کے دروازے تک پہنچ چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک اور آفیسر بھی پہنچا، دونوں نے مل کر زور آزمائی شروع کر دی۔ اس دروازے میں کوئی دو انچ کا خلا پیدا ہو چکا تھا لیکن اس کے بعد بری طرح پھنس چکا تھا۔ اندرونی طرف سے کرنل عامر جدون بھی پوری قوت سے دروازہ کھولنے کی سعی کرتے رہے لیکن دروازے نے کھلنا تھا

نہ کھلا۔ کرنل عامر جدون کے پسِ منظر میں ان کے اہلِ خانہ بے یارومددگار دِکھائی دے رہے تھے۔ پانی تیزی سے کیبن میں بھرتا جا رہا تھا اور پھر اچانک پانی کا ایک اور ریلا آیا اور کیبن کی چھت تک پہنچ گیا۔

اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اس پانی میں انجن کا ڈیزل بھی ملا ہوا تھا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا چھا چکا تھا۔ لیفٹیننٹ مدثر کو پانی نے فرش سے اٹھایا اور چھت سے جا لگایا۔ لیفٹیننٹ مدثر کو بے رحم پانی کے اندر معصوم سیف اللہ جدون اور فاطمہ جدون بھی کیبن کی چھت کی طرف بلند ہوتے دِکھائی دیئے۔ ادھر لیفٹیننٹ کرنل عامر جدون دروازے سے پیچھے پلٹتے دِکھائی دیئے۔ دوسرے آفیسرز بھی پانی کے سامنے تقریباً بے بس ہو چکے تھے۔ لیفٹیننٹ مدثر کہتے ہیں۔ ''یہ وہ لمحہ تھا جب پانی مجھ پر غالب آ چکا تھا، اب میں نے گھپ اندھیرے میں ایک آخری کوشش کے طور پر پھنسے ہوئے دروازے کی سمت ہاتھ بڑھا کر زور لگایا۔ میرا تھوڑا سا بازو جیسے دروازے کے معمولی سے خلا میں اٹک گیا۔ میرے کانوں میں پانی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دروازے کا خلا بالکل ہی ناکافی تھا اور مجھے اس کا ادراک تھا۔ بس اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ گہرے اندھیرے اور یخ بستہ پانی میں میری سانسیں اب جواب دے رہی تھیں۔ میں نے جدوجہد ترک کر دی۔ سانس لینے کی توانائی بھی ختم ہو گئی۔ میں موت کا انتظار کرنے لگا۔ چند ہی ثانیوں میں مجھے احساس ہوا کہ زندگی اتنی آسانی سے نہیں چھوڑی جا سکتی۔ میں نے آخری بار ایک بھرپور کوشش کرنے کا سوچا اور خود کو دروازے کے معمولی سے خلا کی طرف دھکیلنے لگا۔ جلد ہی میرا کندھا اور پھر پورا بازو باہر نکل گیا اور پھر میرا اوپر کا دھڑ باہر نکل آیا۔ اب میں نے اپنے دونوں بازوؤں سے بھرپور زور لگایا اور آزاد ہو گیا میں اٹھا۔ روشنی کی ایک لکیر سی اندھیرے کو چیرتی ہوئی اندر داخل ہو رہی تھی۔ جلد ہی میں سطح پر ابھر چکا تھا۔ روشنی اور آوازیں! میں بھی چلایا، اندر بچے ہیں کوئی مدد کرو، کوئی بچاؤ۔ یہ ریل کی چھت تھی۔ اسی چھت پر مجھے لیفٹیننٹ کاشف دکھائی دیئے۔''

لیفٹیننٹ کاشف کاظمی چھ فٹ 3 انچ کے ایک دراز قد نوجوان آفیسر ہیں جو اپنی درازی قد

پر سب سے زیادہ اللہ کا شکر اس وقت بجا لائے جب پانی دوسروں کے سروں سے تو گزر چکا تھا لیکن لیفٹیننٹ کاشف کاظمی کی ٹھوڑی تک پہنچ کر بے بس ہو گیا تھا۔ جب ٹرین پٹڑی سے اتر کر چنگھاڑتے ہوئے پل کے ایک دیو قامت ستون سے ٹکرائی تو اس وقت لیفٹیننٹ کاظمی کیپٹن کاشف کی زبانی زندگی کے دلچسپ واقعات سن سن کر قہقہے لگا رہے تھے۔ دِل دہلا دینے والی آواز اور جھٹکے نے دونوں آفیسرز کو روئی کے گالوں کی طرح سیٹوں سے اٹھا کر سامنے کی دیوار پر پٹخا۔ اب ٹرین کی یہ بوگی جیسے ایک لمحے کے لئے فضا میں معلق ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہو چکا تھا، کسی کے پاس ردِعمل کا وقت ہی نہ تھا۔

کیپٹن کاشف اور لیفٹیننٹ کاظمی کے اوسان ابھی تک بحال تھے۔ دونوں آفیسرز تیزی سے اٹھے اور کیبن سے باہر گیلری کی طرف دوڑے۔ انہیں بھی کمانڈنگ آفیسر کے زور زور سے پکارتے ہوئے بچوں کی آہ و پکار سنائی دی۔ دونوں آفیسرز نے جلدی سے سارے کیبن چیک کئے تو ایسے لگا کہ سب لوگ پہلے ہی باہر نکل چکے تھے۔ البتہ کمانڈنگ آفیسر اور ان کے اہلِ خانہ ابھی تک اندر ہی تھے۔ چاروں اطراف سے کیبن میں پانی بھر رہا تھا۔ میجر عادل پہلے ہی گیلری میں تھے۔ سبھی آفیسرز نے مِل کر کوشش کی لیکن کمانڈنگ آفیسر کا کیبن کھولنے میں ناکام رہے۔ جب پانی چھت تک پہنچ گیا اور مکمل اندھیرا چھا گیا تو ایسے میں لیفٹیننٹ کاظمی کہتے ہیں۔

میں اس احساس کو بیان نہیں کر سکتا کہ جب ہم خود کو مکمل طور پر بے یار و مددگار محسوس کر رہے تھے۔ موت یقینی تھی، میں گیلری کے اطراف میں مڑا، میرے خیال میں وہاں ایک کھڑکی ہونی چاہیے تھی۔ ذرا سا ٹٹولا تو کھڑکی پر پڑے شٹر کے لاک پر ہاتھ پڑ گیا۔ دو تین کوششوں میں شٹر کھل گیا۔ میں پہلے ہی 15 سیکنڈ سے سانس روکے ہوئے تھا۔ میں نے جلدی سے اپنا سر اس کھڑکی سے باہر نکالا اور آہستہ آہستہ اوپر کی طرف جانے لگا، جلد ہی میں سانس لے سکتا تھا۔ میں جلدی سے بوگی کی چھت پر پہنچ چکا تھا جو آہستہ آہستہ خود ڈوبنے والی تھی۔ اس طرح میں پانی سے باہر آنے والا پہلا آفیسر تھا۔ باہر آتے ہی میں نے چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو بتانے کی کوشش کی

کہ یہ کھڑکی کھلی ہے اور اس سے باہر آنے کی کوشش کریں لیکن بے سود۔ کوئی ایک آدھ منٹ ہی گزرا تھا کہ اچانک لیفٹیننٹ مدثر بھی پانی سے نمودار ہوئے، میں نے فوراً انہیں چھت کے اوپر کھینچ لیا۔

وہ مسلسل حواس باختہ انداز میں چلا رہے تھے کہ "اندر بچے ہیں کوئی مدد کرو، کوئی بچا لو۔" میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو سپر ذیشان ملحقہ بوگی کی کھڑکی سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا، جو ہوا میں معلق تھی۔ وہ سمارٹ تھا لیکن اس کی بیلٹ آڑے آ رہی تھی میں نے اسے بیلٹ اتارنے کا مشورہ دیا اور پکڑ کا کھینچ لیا۔ اسی طرح ہم دو تین اور لوگوں کو بھی بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ دراصل اس بوگی کی کھڑکیوں پر لوہے کی سلاخیں تھیں اور کسی آدمی کا گزرنا ممکن نہ تھا۔ اب ہم نے پانی میں تیرتے ہوئے لکڑی کے ایک مضبوط اور بھاری ٹکڑے کو اٹھایا اور اس کی مدد سے کھڑکیوں کی سلاخیں توڑنے لگے۔ یوں متعدد لوگ باہر نکل آئے جنہیں ہم نے ایک اور لکڑی کو بطور پل استعمال کرتے ہوئے محفوظ بوگی کی چھت پر منتقل کر لیا۔

لیفٹیننٹ کاشف کاظمی اور لیفٹیننٹ مدثر حسن اگرچہ خود موت کے منہ سے بال بال بچے تھے لیکن اب وقت لٹے پٹے قافلے کو سنبھالنے کا تھا۔ دونوں نوجوان آفیسرز کے اندر جیسے نہایت سنجیدہ اور ذمہ دار روحیں عود کر آئی تھیں۔ انہیں یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہیں لگی تھی کہ یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر اور دیگر سینیئر آفیسرز کے بچنے کی اب کوئی امید نہیں تھی اور وہ جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔ کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل عامر جدون نے شہادت کا یہ رتبہ اپنی اہلیہ تہمینہ جدون، ننھے منے بچوں سیف اللہ جدون اور فاطمہ جدون سمیت پایا تھا۔ یقیناً یہ ان کے اللہ کے ہاں عظیم مرتبے کا ثبوت تھا۔ ان کی انسانیت سے ہمدردی کا یہ عالم کہ ایک بار مری میں تعیناتی کے دوران رات 9 بجے دفتر سے واپس آتے ہوئے ایک بوڑھی عورت نے بس سٹاپ تک لفٹ مانگی تو اسے لے کر بس سٹاپ چل پڑے۔ جب بس سٹاپ پر گاڑی نہ ملی تو بوڑھی عورت کی مجبوری اور بے بسی دیکھتے ہوئے اپنی دن بھر کی تھکاوٹ کی پروا کئے بغیر مری سے راولپنڈی چل پڑے اور خاتون کو

راولپنڈی پہنچا کر دم لیا۔ جوانی میں جب کیپٹن تھے تو دریائے سندھ کے بہاؤ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے چھلانگ لگا کر ایک ڈوبتے ہوئے پولیس والے کو بچا لیا۔ اللہ نے انہیں ماں باپ کے ساتھ حج کا موقع دیا تو ایک طرف بیمار والد اور دوسری طرف والدہ کی دیکھ بھال کا اعزاز ملا حالانکہ دونوں کے حرم جانے کے اوقات بھی مختلف تھے۔ آفیسرز میں دوسرے نمبر پر میجر عادل شریف شہید تھے جو اپنی ایک سالہ میٹ عسال عادل کی جان تھے۔ ان کے ایک بھائی لیفٹیننٹ کمانڈر محمد عامر شریف پاکستان بحریہ میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ 'ٹائیگرز آف کے کے ایچ' کے تیسرے آفیسر جنہوں نے جامِ شہادت نوش کیا، وہ کیپٹن کاشف تھے۔

کیپٹن کاشف ایک زندہ دِل انسان، ہنس مکھ آفیسر اور خوب صورت نوجوان تھے۔ اِن کے والد میجر (ریٹائرڈ) ارشاد علی گورایہ کا تعلق بھی پاک فوج سے ہے جبکہ ان کے ایک بھائی میجر طارق تا حال پاک فوج میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کیپٹن کاشف کے اہلِ خانہ کے لئے ان کی شہادت کی خبر ناقابلِ یقین تھی۔ ان کی بہن ڈاکٹر ماہم گورایہ سے جب ہم نے تاثرات پوچھے تو یوں گویا ہوئیں:

''میرا بھائی میرے لئے کیا تھا اور کیسا تھا اس کا اظہار میرے بس میں نہیں۔ تو پھر جس بات کو نہ جملوں میں ڈھالا جا سکے نہ نثر میں قید کیا جا سکے تو اِس پر میں کیا کہوں؟ 2 جولائی 2015 میرے اور میرے گھر والوں کے لئے کڑے امتحان کا دِن تھا۔ 28 سال تک محبت، پیار اور مسکراہٹیں بانٹنے والا میرا بھائی کیپٹن کاشف اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر چکا تھا۔ الرحمن نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا اور وہ ہم سے عبادالرحمن بننے کا تقاضا کر رہا تھا۔ یہ خیال کہ کاشف سے یہ ملاقات درحقیقت اپنے بھائی سے میری آخری ملاقات ہے مجھے نڈھال کر رہا تھا۔ ہر قدم کے ساتھ حزن وملال میرے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ تصویرِ زندگی سے رنگ مدھم ہو رہے تھے۔ گوجرانوالہ کینٹ کی وہ گلیاں اور سڑکیں جو ہم بہن بھائیوں کے قہقہوں سے گونجا کرتی تھیں، آج مجھے میرے بھائی کی شہادت کی خبر دے رہی تھیں۔ بحیثیت ڈاکٹر سب کچھ جان اور سمجھ لینے

کے باوجود میں نے بار بار یہ سوال دہرایا' کیا کچھ نہیں ہوسکتا'۔ پھر میری آنکھوں نے وہ منظر بھی دیکھا کہ سفید چادر تلے چھپا ایک جسدِ خاکی ہے اور اس کے ساتھ کیپٹن کاشف کے الفاظ رقم ہیں۔ دِل نے پھر رب العالمین سے اِلتجا کی کہ یہ میرا بھائی، میری متاعِ جان نہ ہو، پھر چادر ہٹائی گئی تو ہر چیز ساکت و جامد ہوگئی۔ وقت جیسے تھم گیا اور حقیقت در حقیقت مجھے پر عیاں ہوتی رہی۔ عزت، احترام، تکریم کے معنی پہلی بار مجھ پر واضح ہوئے۔ میں نے آگے بڑھ کر اللہ کے اِس مہمان کا ہاتھ چوم لیا۔ اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا، میری زبان نے کاشی، کاشی کی صدا دی، میں نے اللہ کے اس سپاہی کے ماتھے کو بوسہ دِیا۔ اپنی رضا اور خوشی کا اظہار کیا تا کہ اللہ تعالیٰ کو بتا سکوں کہ تیرے چند دِل گرفتہ بندوں نے اپنی سب سے پیاری چیز، تیری امانت سمجھ کر تیری طرف اس طرح لوٹائی ہے کہ ان کی آنکھیں اس جدائی پر اشک بار ہیں مگر اِن کے دل تیری مشیت پر مسرور ہیں۔ وہ تجھ سے راضی ہیں، تیرے انعام پر شاداں وفرحاں ہیں، تیری رحمت کے منتظر ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کی اس امانت کو میں نے چوما اور بار بار چوما، چاہا کہ اس کے چہرے، ہاتھ اور پاؤں کے نقش ونگار ذہن نشین کرلوں۔ وقفے وقفے سے میرے بھائی میجر طارق کی آواز بھی کانوں میں پڑتی رہی کہ ''اللہ تعالیٰ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے جنت الفردوس میں اپنے بھائی سے ملانا۔''

پھر میں اپنے والد اور والدہ سے ملی، انہوں نے مجھے دِلاسہ دیا، نہ میں نے انہیں۔ بس آنسوؤں کو بہنے دِیا، کیونکہ جانے والا ایسا تھا کہ اس کے جانے پر آنسو بہائے جائیں، وہ کہ جو ہم بہن، بھائیوں میں سب پر سبقت لے گیا اور جس شہادت کی تمنا اور خواہش ہم دِلوں میں لئے پھرتے رہے، جس خوبی اور لذت کے قصے ہم سکول و کالج میں سٹیج پر بیان کرتے رہے، وہ اس عظیم مرتبے کو پہنچ کر حیاتِ جاوداں حاصل کر گیا۔ ڈاکٹر ماہم گورایہ اپنے بھائی کی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے مزید بتاتی ہیں۔ ''گرمیوں کی ایک دوپہر، میں اور بھائی سکول سے واپس آرہے تھے۔ راستے میں سڑک کے کنارے ایک بھکاری بیٹھا ہوا تھا۔ ہم اپنی خوش گپیوں میں مگن اس سے گزر

کر کچھ آگے نکلے تو بھکاری نے کہا کہ اللہ کے نام پر کچھ دے جا۔ کاشف بھائی پیچھے مڑے اور کچھ پیسے اسے دے کر آئے۔ پھر مجھ سے کہا کہ جب بھی کوئی اللہ کے نام پر مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں ضرور اسے کچھ دیتا ہوں۔ یہ غالباً اس زمانے کی بات ہے جب بھائی آٹھویں جماعت میں اور میں غالباً تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ لیکن بھائی کی سکھائی گئی یہ بات سالوں بعد بھی میرے ساتھ ہے اور چودہ پندرہ سال کے اس لڑکے کی فراست مجھے آج بھی تعجب میں مبتلا کر دیتی ہے۔"

"میں اکثر پڑھا کرتی تھی کہ خشیتِ الٰہی سے لوگوں کی آنکھیں جھک جاتی ہیں اور ان کے چہرے پر اس کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ لیکن اس کا عملی اظہار میں نے 28 فروری 2015 کو تب دیکھا جب بھائی مجھے ہسپتال سے واپسی پر پک کرنے آئے۔ میری ایک دوست جو کہ ریڑھ کی ہڈی کی سرجری کی وجہ سے ٹھیک سے چل نہیں سکتی اور چلنے کے لئے سپورٹ کا استعمال کرتی ہے، مجھے اچانک ملنے کے لئے آئی۔ میں نے بھائی سے ان کا تعارف کروانا چاہا تو دیکھا کہ بھائی کا چہرہ عاجزی اور انکساری سے سرخ ہے اور ان کے ہونٹ اللہ سے دعا کرتے ہوئے ہل رہے ہیں۔ اللہ کے خوف سے مومن کا دل کس طرح نرم پڑتا ہے میں نے اس دن اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ واپسی پر بھائی برابر مجھے تلقین کرتے رہے کہ میں اپنی دوست کا خاص طور خیال کروں اور ان کا حوصلہ بڑھاتی رہوں۔ یہاں تک کہ میں نے اپنی دوست کو میسج کیا کہ مجھے لگتا ہے کہ وہ میرا نہیں آپ کا بھائی ہے۔ بھائی کی شہادت پر میری اس دوست نے مجھ سے کہا کہ میں ساری رات یہ سوچتی رہی کہ جو لوگ سب سے مختلف ہوتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی خاص نظر میں ہوتے ہیں۔ بھائی کی شہادت کے بعد ایک خاتون ہمیں ملیں جو میرے چچا کے گھر کے پاس رہتی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا بیٹا چھت سے گر کر زخمی ہو گیا تھا۔ گھر پر اس وقت کوئی موجود نہ تھا، ان کے رونے اور چیخنے سے اردگرد سے لوگ جمع ہوئے تو ان میں کاشف بھائی بھی تھے۔ انہوں نے فوراً اس بچے کو گاڑی میں بٹھایا اور ہسپتال لے گئے اور مکمل طبی امداد دلانے کے بعد واپس آئے۔ وہ خاتون بار بار یہ کہتی رہی، 'اس نے تو میرے بیٹے کو بچایا تھا'۔ بھائی کی جگہ شاید

کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا لیکن جو بات مجھے سوچنے پر مجبور کرتی ہے وہ یہ ہے کہ بھائی نے آج تک اس واقعے کا ذکر ہم سے نہیں کیا۔ ان کے لئے یہ شاید کوئی اہم بات نہ ہو اور شاید یہی اصل نیکی کا معیار ہے کہ کرنے والا اس سے بے خبر رہے گویا کہ اس نے کوئی قابلِ ذکر کام کیا ہی نہ ہو۔''

ان کے بھائی میجر طارق نے پرانی تصاویر حاصل کرنے کے لئے ان کے بریگیڈ میں رابطہ کیا تو بریگیڈ کے جی تھری کیپٹن وقاص نے کیپٹن کاشف کا ذکر یوں کیا،'' کیپٹن کاشف گورایہ بریگیڈ میں میری آمد سے پہلے انفینٹری سکول کورس پر جا چکے تھے تاہم اس بریگیڈ میں ہر طرف کاشف گورایہ کی شہرت کے قصے عام تھے، سب کو کہتے سنا کہ ان کی قیادت میں انجینئر کمپنی نے رحیم یار خان میں بہت اعلیٰ کام کیا۔ اسی شہرت کی بنیاد پر کیپٹن کاشف سے ملنے کا بہت اشتیاق ہوا۔ پھر ایک دن کیپٹن کاشف کورس کے بعد بنالین ہیڈ کوارٹر پنوں عاقل سے رحیم یار خان آئے تو ملاقات ہوگئی۔ ایک ہی ملاقات میں ان کو اتنا اچھا پایا کہ ان کا چہرہ مسکراہٹ اور باتیں دِل پر نقش ہوگئی ہیں۔''

میجر طارق پاک فوج سے کیپٹن کاشف کے لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ''2005 میں جب کاشف کو پتہ چلا کہ وہ آئی ایس ایس بی کلیئر کر کے پاک فوج کے لئے سلیکٹ ہوگیا ہے تو سب سے پہلے سجدے میں گر کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ اکتوبر 2011 میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول سے پاس آؤٹ ہوا اور میرے پاس پہنچا تو مجھے فخر سے سلیوٹ کیا۔ میں نے سلیوٹ کا جواب دینے کے بجائے فرطِ جذبات میں گلے سے لگا لیا اور سرِ فخر سے بلند ہوگیا کہ میرا بھائی بھی پاکستان آرمی میں میرا ساتھی بن چکا ہے۔ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ ملک وقوم کا یہ بہادر بیٹا شہداء اسلام کی صف میں شامل ہو کر حیاتِ جاوداں پانے والا ہے۔''

اس خصوصی ٹرین قافلے کے نوجوان شہید لیفٹیننٹ محمد عباس کو اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادات اور اپنے محبوب سے ملن کے جذبے پر کم سنی میں ہی مقام شہادت عطا کر دیا۔ ان کے ایک کزن کیپٹن محمد عامر سجاد کا کہنا ہے کہ''لیفٹیننٹ عباس بچپن سے ہی سب کی آنکھوں کا تارا، نہایت دلیر،

باوفا اور ذہین نوجوان تھا، وہ ہمیشہ نمایاں پوزیشن حاصل کرتا تھا اور جہان فانی سے جاتے ہوئے بھی امتیازی مقام حاصل کر کے رخصت ہوا۔ ''شہادت کا درجہ پانے والوں میں آفیسرز کے ساتھ ساتھ 'ٹائیگرز آف کے کے ایچ' کے روحِ رواں صوبیدار میجر اسلام خان، نائیک عارف محمود، لانس نائیک ظفر حیات، سپیر سلطان زیب، سپیر محمد سلیم، سپیر دھنی بخش، کک نصیر احمد، باربر شاپ کے کنٹریکٹر محمد عثمان اور دھوبی شاپ کے کنٹریکٹر محمد ارشد شامل ہیں۔

جائے حادثہ پر اب سینئر ترین آفیسر لیفٹیننٹ کاشف کاظمی اور لیفٹیننٹ مدثر حسن ہی تھے۔ وہ انتہائی چابکدستی سے اپنی ریزہ ریزہ یونٹ کے بکھرے ہوئے حصوں کو منضبط کرنے اور موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا زخمیوں کو بچانے لگے۔ یونٹ کے سولجرز بھی بڑھ چڑھ کر پوری ذمہ داری سے ان کے احکامات بجالاتے۔ اس طرح جلد ہی جائے حادثہ کو محفوظ بنا کر زخمیوں کو ریسکیو کے لئے تیار کیا جانے لگا۔

دراصل چند لمحوں میں بپا ہونے والے اس خوفناک حادثے نے ہر طرف چیخ و پکار اور خوف و ہراس بپا کر دیا تھا۔ دیو قامت ستونوں والا پل کسی کاٹھ کباڑ کے جھونپڑے کی طرح ٹوٹا پڑا تھا۔ ٹرین کے ڈبے ماچس کی ڈبیوں سے بنی بچوں کی ریل گاڑی کی طرح ہوا میں معلق اور کچھ نہر میں ڈوبے ہوئے تھے۔

دونوں آفیسرز اور سولجرز بے بسی کے عالم میں ڈوبنے والوں کو بچانے کے لئے کبھی کلہاڑوں کی مدد سے ڈوبتے ہوئے ریل گاڑی کے ڈبے کی چھت پھاڑنے کی کوشش کرتے تو کبھی دائیں بائیں سے ڈبوں میں پھنسے لوگوں کو نکالنے کی کوشش کرتے لیکن یہ سب کوششیں بے کار تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے پوری بوگی پانی میں ڈوب گئی۔ البتہ دوسرے ڈبوں میں پھنسے سولجرز، عورتوں اور بچوں کو بچا لیا گیا۔ دونوں آفیسرز نے چاروں اطراف میں محافظ کھڑے کئے اور ننگے پاں بھاگ بھاگ کر ریسکیو کا کام جاری رکھا تاوقتیکہ قریبی شہروں سے ریسکیو کی ٹیمیں اور سینئر فوجی آفیسرز پہنچنا شروع ہو گئے۔ اب حادثے کے مقام پر کور کمانڈر گوجرانوالہ لیفٹیننٹ جنرل غیور احمد بنفسِ نفیس

پہنچ چکے تھے اور ان کی کور کے متعدد آفیسرز اور ریسکیو ٹیمیں مصروفِ عمل تھیں۔ علاوہ ازیں ایس ایس جی ڈائیورز جنہیں ہیلی کاپٹر کے ذریعے منگلا سے لایا گیا جبکہ سول ڈائیورز جو جہلم سے بذریعہ روڈ گئے، انہوں نے جانیں بچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ابتدائی امدادی کاموں میں گوجرانوالہ کے آرمرڈ ڈویژن اور منگلا کور انجینئرز کے دستوں نے بھی عمدہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

جامکے چٹھہ کے قریب حادثے کا شکار ہونے والی اس خصوصی ٹرین نے چار آفیسرز، ایک آفیسر کی اہلیہ، دو بچوں، ایک صوبیدار میجر، پانچ سولجرز اور تین سویلین ملازمین کی جان لی۔ حادثہ ہونے پر چھناواں پل ٹوٹنے سے ٹرین کا انجن اور تین بوگیاں لوئر چناب نہر میں جا گریں۔ حادثہ اگرچہ تباہ کن اور بھیانک تھا لیکن پاک فوج کی اس مایہ ناز یونٹ 'ٹائیگرز آف کے کے ایچ' نے چند ہی دنوں میں اپنے نئے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل سلیمان اور دیگر نئے آفیسرز میجر عثمان، کیپٹن وصی اور پرانے غازیوں لیفٹیننٹ کاشف کاظمی و لیفٹیننٹ مدثر حسن کی قیادت میں خود کو ایسے سنبھالا کہ سینئر آفیسرز کہہ اٹھے، ''یہ ایک ایسی توانا اور مثالی یونٹ ہے جس نے نہ صرف خود کو زبردست سنبھالا ہے بلکہ ہر سطح پر ایک عمدہ چمک اور اونچا مورال دکھائی دے رہا ہے۔''

*****

بابا سے بات کرائیں

کرنل عقیل احمد

.....•••.....

ایک غازی کا بیٹا ہونے کے ناتے کرنل توصیف میں وطن کی محبت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔انہوں نے عسکری زندگی میں سیاچن، لائن آف کنٹرول (چڑی کوٹ) اور جنڈولہ کے ایکٹیو وارزون میں خدمات سرانجام دیں۔میجر جنرل ثناءاللہ خان نیازی کے ساتھ اگلے مورچوں سے واپسی کے دوران آئی ای ڈی پھٹنے سے 15 ستمبر 2013 کو جامِ شہادت نوش کیا اور خالق حقیقی سے جا ملے۔

اس دن، میں معمول کے مطابق ویک اینڈ گزار رہا تھا۔ظہر کی نماز مسجد میں پڑھنے کے بعد گھر واپس آیا ہی تھا کہ موبائل پر ایک دوست کی کال آئی۔انہوں نے دریافت کیا کہ کیا میں ٹی وی دیکھ رہا ہوں؟ میں نے نفی میں جواب دیا۔اس پر انہوں نے مجھ سے جو بات شیئر کی اس پر میں ٹیلی ویژن کی طرف لپکا۔آن کرنے پر بریکنگ نیوز نے جیسے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین ہی کھینچ لی، سانس ٹھہر سی گئی کہ اپنے پیارے چھوٹے بھائی کی تصویر کے ساتھ اس کی شہادت کی خبر ہر نیوز چینل پر چل رہی تھی۔کچھ دیر تک سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے بچھڑنے پر روؤں یا شہید کا بھائی ہونے کے ناتے فخر کروں۔ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار تھا کہ فوراً والدین کا خیال آیا

اور میں ان کی طرف روانہ ہوا۔میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ ٹی وی پر اپنے بیٹے کی شہادت کی خبر دیکھ چکے تھے۔ایک اسلامی گھرانہ ہونے کے ناتے شہادت پر یقین تو سو فیصد تھا اور ہے مگر بھائی کی جدائی کے تصور نے اندر سے توڑ کر رکھ دیا۔اس اٹل حقیقت کو قبول کرنے کی طاقت جیسے ختم ہو گئی۔ میں بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں چنانچہ اپنے آپ کو سنبھالا اور والدین کو تسلی دی۔ اس دوران ایک ہی بات لب پر تھی،''وہ زندہ ہے وہ زندہ ہے۔۔۔شہید زندہ ہے۔''

سی ایم ایچ پہنچ کر بھائی کا جسد خاکی لینے کے بعد ایمبولینس میں اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔

ایک شہید کا چہرہ!وہ سکون کی نیند سویا ہوا تھا اور اس کے لبوں پر جو مسکراہٹ تھی وہ مجھے آج بھی یاد ہے۔اس مسکراہٹ کو دوسرے لوگوں نے بھی محسوس کیا۔ بھائی کی شہادت نے قرآن اور حدیث میں ایک شہید کے بارے میں بیان کی گئی تمام جہتوں کو میرے سامنے دوبارہ کھول دیا۔ ہر قدم پر اللہ تعالیٰ نے دکھایا کہ شہید کا مرتبہ کتنا عظیم ہے۔ایک شخص جسے اللہ شہادت کے رتبے پر فائز کرتا ہے وہ خدا کو کتنا پیارا ہوتا ہے۔اس کے جنازے میں تمام فورسز کے سربراہان کے علاوہ ہر مکتبہ فکر کے بے شمار لوگوں نے شرکت کی۔ ہیڈ کوارٹرز 10 کور کے گراؤنڈ میں تا حدنگاہ لوگ ہی لوگ تھے۔پہلی نماز جنازہ گھر کے قریب پڑھی گئی۔ دوسری نماز جنازہ بھی کچھ کم بڑی نہ تھی۔ یہ بات خدا نے مجھ پر عیاں کی کہ جس شخص کو اللہ اتنی عزت دیتا ہے اس کی دنیا میں اس کے بندے بھی اتنی ہی عزت دیتے ہیں۔اس سے پہلے قبر دیکھ کر مجھ پر خوف کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔مگر جب بھائی کی قبر کے پاس جا کر کھڑا ہوا تو میرا احساس مختلف تھا۔اتنی کشادہ اور خوبصورت قبر کہ بیان نہیں کر سکتا اور کیوں نہ ہو،وہ زمین بھی رشک کرتی ہے جس میں شہید کو اتارا جاتا ہے۔

وہ کتنا عظیم بھائی تھا کہ جس کی شہادت کے بعد اور تدفین سے پہلے حرم میں اس کے ایصالِ ثواب کے لئے دعائیں اور طواف شروع ہو گئے۔ چند قریبی رشتہ دار (خالہ کزن اور دیگر) اس وقت مکہ مکرمہ میں حج کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔اسے اللہ کے سپرد کرنے کے بعد، جب

رات گئے چند لمحوں کے لئے آنکھ لگی تو، توصیف کو پہلی بار چمکتے ہوئے احرام میں، حرمِ پاک میں دیکھا۔

بھائی کی شہادت کے بعد ان لوگوں سے ملاقات ہوئی جو اس کے ساتھ کسی نہ کسی تعلق سے قریب رہے۔ جس سے بھی ملاقات ہوئی اس نے بھائی کے بارے میں ایسی ایسی باتیں بتائیں، جن کا مجھے علم نہیں تھا۔

میٹرک کے بعد بھائی نے آرمی جوائن کر لی تھی چنانچہ اس کا زیادہ وقت اپنے حلقہ احباب میں گزرا۔ صرف چھٹی پر ہی ملاقات ہوتی تھی۔ اس کی زندگی کے کئی ایسے پہلو میرے سامنے آئے جن کے بارے میں، میں بہت کم یا بالکل ہی نہیں جانتا تھا۔ اس کا روم میٹ اور کورس میٹ مسجد کے باہر میرے ساتھ اس عظیم شخص کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ توصیف کے بارے میں ایک ایسی بات بتاؤں جس کا آپ کو بھی نہیں معلوم ہوگا۔ ''وہ ہر نماز کے بعد شہادت کے لئے دعا کرتا تھا۔''

میرا بھائی شہادت سے کچھ پہلے ضلع دِیر جو کہ پاک افغان سرحد پر واقع ہے، سے چند دن کی چھٹی آیا ہوا تھا اور والدہ کے ساتھ گھر میں بیٹھا بات چیت کرتے ہوئے کہنے لگا: ''امی جان اللہ تعالیٰ کا مجھ پر کتنا فضل ہے۔ اچھا پڑھنے لکھنے کے بعد ایک بہترین پروفیشن کو جوائن کیا۔ آج اللہ کے فضل سے یونٹ کی کمانڈ کر رہا ہوں۔ اللہ نے خوب صورت اور محبت کرنے والی بیوی دی اور فرمانبردار اولاد سے نوازا۔ اللہ کی بہت کرم نوازی ہے اور اس کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ بس دو خواہشیں رہ گئی ہیں جسے اللہ پورا فرما دیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ بیٹی عطا کر دے۔ (اس سے پہلے بھائی کے تین بیٹے ہیں) اور دوسری اللہ شہادت کی موت دے''۔ والدہ نے جواب دیا کہ بیٹی کے لئے میں ضرور دعا کروں گی مگر ایک ماں کے لئے دوسری دعا کرنا مشکل ہے۔ کیا قبولیت کی گھڑی تھی کہ اللہ نے کچھ عرصے میں بیٹی کی نعمت سے نوازا اور اس کے بعد شہادت کے اعلیٰ مقام پر فائز کر دیا۔ (سبحان اللہ)

بھائی کی یونٹ 33 بلوچ رجمنٹ کے سیکنڈ ان کمانڈ (ٹو آئی سی) نے کچھ بہترین یادیں شیئر کرتے ہوئے بتایا کہ جب آخری بار وہ یونٹ سے مالاکنڈ پوسٹ پر جنرل آفیسر کمانڈنگ (جی او سی) کو رسیو کرنے نکلے تو گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ہلکے سے مسکرائے اور کہا ٹو آئی سی، ہولڈ دی فورٹ۔ وہ کئی بار یونٹ سے باہر کسی نہ کسی کام سے جاتے رہے مگر یہ الفاظ انہوں نے پہلی اور آخری بار استعمال کئے۔

میرے شہید بھائی نے اپنی اولاد کی بہترین تربیت کی۔ یونٹ کی کمانڈ سنبھالنے سے پہلے راولپنڈی میں پوسٹنگ تھی۔ یہاں پر اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے دونوں بڑے بیٹوں کو دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن کا حافظ بھی بناؤں۔ یہ تو اب سمجھ آتا ہے کہ اس کا ہر قدم اسے اللہ کے نزدیک کر رہا تھا اور اس کی ہر کوشش اس کی خوشنودی حاصل کرنا تھی۔ آج ماشا اللہ حمزہ احمد نے مکمل قرآن حفظ کر لیا ہے اور دوبارہ چھٹی جماعت میں داخلہ لے لیا ہے۔ حذیفہ احمد (بڑا بیٹا) کے اب صرف چار پارے حفظ کے رہ گئے ہیں اور یوں وہ اپنے پیچھے صدقہ جاریہ کا انتظام کر گیا۔ خدیجہ (بیٹی) تو وہ محبت کبھی محسوس نہیں کر سکے گی کہ جس محبت سے اسے توصیف نے اللہ سے مانگا تھا۔

کرنل توصیف اپر دیر کے مقامی لوگوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ دور دراز علاقہ تھا، جہاں طبی سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ کرنل توصیف نے اپنی یونٹ کے ڈاکٹر کو خصوصی ہدایات دی ہوئی تھیں کہ یونٹ میں ہمیشہ اضافی دوائیں موجود ہونی چاہئیں وہ میڈیکل کیمپس کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ جن میں مقامی لوگوں کا علاج کیا جاتا تھا۔ گردونواح کے علاقے میں لوگ کرنل توصیف کو "میرا کرنل" کے نام سے پہچانتے تھے۔ ایک دفعہ وہ بٹالین ہیڈ کوارٹرز کی طرف آ رہے تھے جب راستے میں انہیں ایک عمر رسیدہ شخص سڑک کے کنارے نظر آیا۔ اپنی گاڑی روکی اور پوچھا۔ بابا جی آپ کا کیا حال ہے، امید ہے ٹھیک ہوں گے۔ بابا جی نے کہا کہ نہیں بیٹا، تھوڑا بیمار ہوں۔ کرنل توصیف اسے بٹالین ہیڈ کوارٹرز لے آئے اور ڈاکٹر سے مکمل چیک اپ کروا کر میڈیسن دیں۔

33بلوچ رجمنٹ کے نئے کمانڈنگ آفیسر جب کمانڈ سنبھالنے کے بعد اپنے ٹو آئی سی کے ساتھ اگلی پوسٹوں کا دورہ کرنے نکلے تو راستے میں ایک بزرگ نے گاڑی روکی۔ فرنٹ سیٹ پر کسی اور شخص کو دیکھ کر پوچھا: ''میرا کرنل کہاں ہے؟'' ٹو آئی سی گاڑی سے اترے اور بزرگ کو بتایا کہ کرنل توصیف شہید ہو گئے ہیں تو بزرگ نے کہا۔ ''میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔'' بعد میں معلوم ہوا کہ کرنل توصیف شہید اپنے طور پر اس بزرگ کی مختلف طریقوں سے مدد کیا کرتے تھے۔ کرنل توصیف شہید انتہائی ایماندار اور دیانتدار انسان تھے۔ باقاعدگی سے پانچ وقت کی نماز باجماعت ادا کرتے اور قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ مسجدیں تعمیر کروانا ان کی ہمیشہ ترجیح رہی۔ بٹالین ہیڈکوارٹرز شاہی کوٹ میں خوبصورت مسجد تعمیر کروائی۔ اس کے علاوہ کئی فارورڈ پوسٹوں، جن کی اونچائی دس ہزار فٹ سے بلند ہے، پر بھی مساجد تعمیر کروائیں۔ ایک دفعہ وہ سپر کا سر پوسٹ پر تشریف لائے تو مسجد بنانے کی خواہش ظاہر کی۔ جوانوں نے کہا کہ ایک تو یہاں پانی کی قلت ہے اور دوسرا ڈیوٹی سخت ہونے کی وجہ سے کم فوجی نماز پڑھنے کے لئے آئیں گے۔ کرنل توصیف نے کہا مسجد بنانا شروع کرو پانی بھی مل جائے گا اور نمازی بھی آ جائیں گے۔ آج الحمد للہ اس مسجد میں پانچ وقت باقاعدگی سے نماز پڑھی جاتی ہے۔

بھائی کی شہادت کے بعد اپنے کئی رشتہ داروں سے معلوم ہوا کہ کرنل توصیف باقاعدگی سے ٹیلیفون کال کر کے ان کا حال احوال جانا کرتا تھا۔ خاص طور پر خاندان کی چند بیواؤں سے ہمیشہ فون کر کے ان کی خیریت دریافت کرتا اور مسائل پوچھتا۔ خاندان اور گاؤں والوں کی مدد کرنا اسے اچھا لگتا تھا۔ اس نے کئی لڑکوں کی روزگار حاصل کرنے میں مدد بھی کی جو آج اس کے لئے صدقہ جاریہ ہے۔ ہمارے خاندان کی سب سے بڑی اور بزرگ شخصیت نے ایک دن والدہ سے کہا کہ کرنل عقیل (راقم) کرنل توصیف نہیں بن سکتا؟ والدہ نے پوچھا کہ آپ یہ بات کیوں کر رہے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ کرنل توصیف باقاعدگی سے مجھے فون کر کے میری خیریت دریافت کیا کرتا تھا۔ یہ باتیں ثابت کرتی ہیں کہ میرے شہید بھائی کو خاندان اور اس کی اہمیت کا کتنا

احساس اور ادراک تھا۔ بھائی کی شہادت کے بعد میری ذمہ داریوں میں اضافہ ہوگیا۔ میں نے کچھ وقت لیا کیونکہ دل میں خوف تھا کہ میں اس کی جگہ کیسے لے سکوں گا۔ وہ ایک ذمہ دار خاوند اور شفیق باپ تھا۔ بہرحال ہمت کر کے میں نے توصیف کی فیملی کو ہر ممکن سہولیات بہم پہنچانے سے متعلق کچھ امور نمٹانے شروع کئے۔ اس کوشش کے دوران کئی واقعات پیش آئے جن کا میری زندگی پر گہرا اثر ہے۔ جس آفیسر کو ملا، جس آفس میں گیا، مجھے احساس ہوا کہ میرا تعارف تبدیل ہو گیا ہے، اب میں اپنے آپ کو شہید کے بڑے بھائی کے ناتے تعارف کروانے میں زیادہ فخر محسوس کرتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہماری فیملی کی شناخت بھی ایک عظیم شہید کے ساتھ منسلک ہوگئی ہے۔ مختلف کاموں کے دوران کئی سینئر آفیسرز نے گائیڈ بھی کیا۔ اس رہنمائی کی روشنی میں، میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی بھابھی کی طرف سے ایجوٹینٹ جنرل (اے جی) کو ایک درخواست لکھوں جس میں ممکنہ مسائل کے حل کی تجاویز دوں۔ یہ تجاویز لے کر میں اے جی برانچ پہنچ گیا۔ انتظار کے دوران میرا تعارف ایک اور سینئر آفیسر سے، کرنل توصیف شہید کے بڑے بھائی کے طور پر کرایا گیا۔ ان سینئر آفیسر نے مجھ سے کرنل توصیف کے بارے میں بات چیت شروع کر دی، جو کافی دیر جاری رہی۔ اس دوران انہوں نے مجھے چند اقدامات کے بارے میں بتایا جو پاک فوج توصیف شہید کی فیملی کے لئے کرنے جا رہی تھی۔ میں ان کی باتیں سنتا رہا اور اندر ہی اندر حیران ہوتا رہا کیونکہ پاک فوج نے ہمارے تجاویز شدہ تقریباً تمام اقدامات یا تو شروع کر دیئے تھے یا ان کے بارے میں پلاننگ کر لی تھی۔ ان کی بات ختم ہونے پر میں نے اپنی تجاویز والا خط واپس جیب میں ڈالا اور اجازت چاہی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ تو اے جی سے ملنے آئے تھے، میں نے جواب دیا کہ سر مجھ سے پہلے ہی پاک آرمی نے خود کرنل توصیف شہید کے سب کام سنبھال لئے ہیں۔

بھائی کی شہادت سے دو تین روز پہلے اس نے مجھے فون کیا اور بہت دیر تک مجھ سے اپنی فیملی کے بارے میں مشورہ کیا۔ وہ ان کے لئے راولپنڈی میں مستقل رہائش کا بندوبست کرنا چاہتا تھا

تا کہ وہ ایک سیٹلڈ زندگی گزار سکیں ۔اس کی بڑی وجہ دونوں بیٹوں کا قرآن پاک حفظ کرنا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ان کی دینی تعلیم میں کوئی حرج نہ ہو۔ مجھ سے کئی آپشنز ڈسکس کئے اور کچھ باتوں کا پتا کرنے کے لئے کہا تا کہ آنے والی چھٹی میں وہ ان کے لئے کوئی مستقل بندوبست کر سکے۔ مجھے اس وقت گمان بھی نہیں تھا کہ وہ یہ تمام ذمہ داریاں میرے لئے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ہم دونوں بھائیوں میں ایک گہرا رشتہ تھا۔ وہ زندگی کے ہر موڑ پر مشورے کے ساتھ چلتا تھا۔

میں نے اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کور آف انجینئرز کو جوائن کیا مگر بھائی نے انفنٹری کو ترجیح دی۔ میں اس سے چھ کورس سینئر تھا مگر میری ایمپلائیمنٹ کچھ ایسی رہی کہ بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم ختم کرنے کے بعد وطن واپسی پر ہم دونوں اکٹھے پروموشن بورڈ میں کنسیڈر ہوئے ۔وہ مجھ سے مذاق میں کہا کرتا تھا کہ بھائی! میں آپ سے پہلے پروموٹ ہوجاؤں گا اور پھر آپ مجھے سلیوٹ کیا کریں گے۔اس نے شہادت کا ایسا رتبہ حاصل کرلیا کہ نہ صرف وہ ہم سب سے ہر لحاظ سے آگے نکل گیا بلکہ میں کیا،اس پوری قوم نے اسے سلیوٹ کیا۔اس نے اس قوم کے ہر فرد کے دل میں جگہ بنالی جو دل کی گہرائیوں سے اس کی عظیم قربانی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

عسکری کالونی میں ہمارا گھر مسجد کے بالکل ساتھ ہے یعنی پہلے گھر کا گیٹ ہے اور پھر چند قدموں پر مسجد ہے۔توصیف جب بھی پی ایم اے سے ویک اینڈ یا چھٹی پر گھر آیا کرتا تھا تو کالونی کے گیٹ میں داخل ہونے پر اگر نماز کا وقت ہوتا تو گھر آنے کے بجائے پہلے مسجد میں چلا جاتا اور اللہ کی بارگاہ میں حاضری دینے کے بعد گھر آتا۔نماز کے لئے خاص تیاری کرنا،اس کا معمول تھا۔ وہ اگر کبھی تیار ہوتے ہوئے لیٹ ہو رہا ہوتا تو والدہ آواز دیتی کہ توصیف اس کنگھی شیشے کو چھوڑو کہ نماز کو دیر ہو رہی ہے تو وہ کہتا کہ امی اگر کسی سے ویسے ملنے جانا ہو تو ہم کتنا تیار ہوتے ہیں اللہ سے ملنے کے لئے تیار ہو کر نہ جاؤں؟

بچوں کی اپنے باپ کے ساتھ محبت بہت منفرد ہوتی ہے۔اگر باپ کبھی ان کی تربیت کے

لئے ڈانٹ ڈپٹ کر رہا ہوتا ہے تو وہی باپ اپنے بچوں پر جان چھڑکنے کے لئے بھی ہر لحہ تیار ہوتا ہے۔ کرنل توصیف کی بھی اپنے بچوں کے ساتھ محبت مثالی تھی۔ لیکن چھوٹے بیٹے عمر کے ساتھ تو گویا ان کی دوستی تھی یہی وجہ ہے کہ وہ اس کی کوئی بات رد نہیں کرتے تھے۔ جب وہ یونٹ کی کمانڈ سنبھالنے کے لئے اپر دیر پہنچے تو پی ٹی سی ایل کا ایک خصوصی نمبر عمر کو لگوا کر دیا۔ عمر صبح سکول جاتے ہوئے اور واپسی پر والد کو ضرور فون کر کے بات کرتا تھا۔ اپنے بابا کی شہادت کے بعد وہ انہیں سب سے زیادہ مس کرتا ہے۔ بابا کے بارے میں بار بار پوچھنے پر اس کو سمجھایا گیا کہ آپ کے ابو، اب مٹی کے نیچے چلے گئے ہیں تو اس نے بڑے معصومانہ طریقے سے کہا کہ آپ ان کے پاس ٹیلی فون کیوں نہیں لگوا دیتے تا کہ میں ان سے بات کر سکوں۔

ننھا عمر اب بھی اکثر ٹیلی فون کے نمبر ڈائل کرتا ہے کہ اپنے پیارے بابا سے بات کر سکے ان کی آواز سن سکے۔ مگر ٹیلی فون کی دوسری جانب ہمیشہ خاموشی ہوتی ہے، ابدی خاموشی۔

*****

جو چلے تو جاں سے گزر گئے

لیفٹیننٹ کرنل عارف محمود

.....•••.....

آپریشن ضرب عضب اپنے عروج پر تھا۔شمالی وزیرستان میں پاک فوج کے بے باک جوانوں نے دہشت گردوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تو با جوڑ ایجنسی میں تحصیل سلارزئی کے علاقے ڈھیرئی باندہ میں دہشت گردوں کی خفیہ آمدورفت کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہونے لگا۔ حساس اداروں کی خفیہ معلومات کے مطابق یہ مقام نہ صرف گردونواح میں دہشت گردی کی سرگرمیوں کے لئے استعمال ہو رہا تھا بلکہ اسے ملک کے دیگر علاقوں میں تخریب کاری کے بڑے منصوبے بنانے کی آماجگاہ کے طور پر بھی پروان چڑھایا جا رہا تھا۔اگرچہ آپریشن راہ راست اور راہ نجات کے دوران اس علاقے میں دہشت گردوں کی کمر کافی حد تک توڑ دی گئی تھی اور ان کے سیکڑوں ساتھی اپنے کمانڈروں سمیت ہلاک ہوئے یا پھر حراست میں لے لئے گئے تھے البتہ کچھ شرپسند افغانستان کے ملحقہ صوبے کنڑ کی طرف بھاگ گئے تھے۔بارڈر سے ملحق ہونے کی وجہ سے اب افغانستان میں چھپے یہ دہشت گرد وقتاً فوقتاً اپنے غیر ملکی آقاؤں کی مدد سے سازشوں کا جال بنتے اور اپنی گھناؤنی اور تخریبی سرگرمیوں کو پاک سرزمین تک پھیلانے کی مکروہ کوشش کرتے۔ چنانچہ پاک فوج کے جامع منصوبے کے تحت کمانڈنٹ باجوڑ سکاؤٹس کرنل میر امیر علی کو اس

علاقے سے دہشت گردوں کو مکمل طور پر مٹانے کا حکم ملا۔اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آپریشن کی کمان چترال سکاؤٹس کے ونگ کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل محمد افراز اسلم کو سونپی گئی۔ابتدائی تیاریوں کے بعد 18 جنوری 2015 کی صبح لیفٹیننٹ کرنل محمد افراز اسلم نے اپنے تمام کمپنی کمانڈرز کو باجوڑ سکاؤٹس کے ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا اور آپریشن کے خدوخال پر تفصیلی بریفنگ دی۔یہ آپریشن اگلی صبح 5 بجے شروع ہونا تھا۔آپریشن میں لیفٹیننٹ کرنل محمد افراز اسلم کے زیر کمان چترال سکاؤٹس کے کیپٹن سید وقاص سمیع، دیر سکاؤٹس کے کیپٹن حافظ اسلام شہزاد، آزاد کشمیر رجمنٹ کے میجر قیصر، سندھ رجمنٹ کے لیفٹیننٹ عمر، سپیشل آپریشن گروپ کے میجر احسان اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے میجر فواد شامل تھے۔

صورتِ حال کی سنگینی اور دہشت گردوں کی بھاری تعداد کے پیشِ نظر آپریشن کا دورانیہ 48 گھنٹے رکھا گیا تھا۔علاقے کے جغرافیائی خدوخال سے بھرپور واقفیت کی بنا پر کیپٹن اسلام شہزاد نے دیگر آفیسرز کو آپریشنل علاقے کی ریکی کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ادھر دوسرے ہی دن علی الصبح 4 بجے سپیشل آپریشن گروپ کمپنی اور آزاد کشمیر رجمنٹ کے آفیسرز اور جوان ڈھیرئی بانڈہ کے اطراف سے بیرونی مداخلت اور فرار کی ممکنہ کوشش کو ناکام بنانے کے لئے بلاکنگ پوزیشنیں سنبھال چکے تھے۔دریں اثنا ونگ کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل محمد افراز اسلم اپنی سپاہ کو لے کر اگلی جمع گاہ، باجوڑ سکاؤٹس پہنچ گئے۔اس سپاہ نے نمازِ فجر کے بعد صبح پونے چھ بجے ڈھیرئی بانڈہ کی طرف پیش قدمی کا آغاز کیا۔راستے میں حاجی لوانگ موڑ کے مقام پر کیپٹن اسلام شہزاد پہلے ہی منتظر کھڑے تھے جہاں سے انھیں رہنمائی کا فریضہ انجام دینا تھا۔اب وہ سپاہ کو لے کر وادئ چنار کے راستے سلارزئی تحصیل کے گاؤں ڈھیرئی بانڈہ کی طرف روانہ ہوئے۔

چنار پوسٹ پر پہنچ کر ایک بار پھر کمانڈنگ آفیسر نے اپنے احکامات دہرائے اور اپنے جونیئر کمانڈرز کے ساتھ مطلوبہ دہشت گردوں کی شناخت، ممکنہ ٹھکانوں اور مزاحمت کی متوقع شدت پر تبادلہ خیال کیا۔چنانچہ صبح 7 بجے سپاہ کو چھوٹے گروپوں میں بانٹ کر علاقے کی تلاش کا کام

شروع کر دیا گیا۔ کیپٹن اسلام شہزاد اور کیپٹن وقاص کا پہلا پڑاؤ پرانی چنار پوسٹ تھا۔ ان کے ہمراہ لیفٹیننٹ عمر کی قیادت میں سندھ رجمنٹ اور میجر قیصر کی قیادت میں آزاد کشمیر رجمنٹ کے جوان تھے۔ قوم کے ان رکھوالوں نے مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے اپنے آفیسرز کی رہنمائی میں پیش قدمی کا آغاز کر دیا۔ انہیں مختلف اطراف سے اپنے ہدف کی طرف بڑھنا تھا۔ یہ عمودی چٹانوں پر انتہائی دشوار گزار اور پر پیچ راستے تھے لیکن پاک فوج کے بیباک سولجرز کسی بھی مشکل کو خاطر میں لائے بغیر بھرپور ولولے سے آگے بڑھ رہے تھے۔

کیپٹن وقاص سمیع نے پہاڑی کی چوٹی پر واقع پرانی چنار پوسٹ پر پہنچتے ہی تازہ ترین صورت حال اور علاقائی معلومات دینے کے ساتھ ساتھ مزید احکامات کے لئے اپنے کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل محمد افراز اسلم سے رابطہ کیا۔ ونگ کمانڈر کی طرف سے آگے بڑھتے رہنے کی ہدایت ملنے پر انھوں نے کیپٹن اسلام شہزاد اور کیپٹن وقاص سے باہم رابطہ رکھتے ہوئے مختلف اطراف سے ڈھیرئی بانڈہ کی طرف پیش قدمی جاری رکھی۔ وہ راستے میں پڑنے والی ہر غار اور کھائی کی تلاشی لیتے ہوئے نہایت محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ڈھیرئی بانڈہ سے کوئی 500 میٹر پہلے کیپٹن اسلام شہزاد نے وائرلیس پر کیپٹن وقاص سے رابطہ کیا اور انہیں بالمشافہ مشاورت کے لئے رکنے کی درخواست کی، دراصل وہ بہت سے ایسے سوالوں کا جواب چاہتے تھے جو کیپٹن اسلام سے بہتر کوئی نہ دے سکتا تھا۔ کیپٹن اسلام شہزاد اپنے ہاتھوں میں نقشہ تھامے کافی گہری سوچ میں گم تھے، انہوں نے کیپٹن وقاص کو گاؤں ڈھیرئی بانڈہ اور دیگر اہم علاقوں کے علاوہ تین ایسے احاطے دکھائے جن میں دہشت گردوں کی موجودگی یقینی تھی۔ اس موقعے پر ونگ کمانڈر کی ہدایات بھی مسلسل موصول ہو رہی تھیں۔ ونگ کمانڈر نے واضح طور پر حکم دیا تھا کہ علاقے سے پکڑے جانے والے 12 سال سے زائد عمر کے ہر مشکوک شخص کی مکمل چھان بین کی جائے اور یہ کام کیپٹن وقاص کے ذمے لگایا گیا تھا۔

دن کے تقریباً سوا بارہ بج رہے تھے کہ اچانک فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ یہ

گولیاں یقیناً دوستانہ فائر نہیں تھا، گویا دہشت گردوں نے بھرپور مقابلے کا اعلان کر دیا تھا۔ کیپٹن وقاص اور کیپٹن اسلام نے آپس میں رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ اپنے سولجرز ان گولیوں کی زد میں تھے۔ دونوں نے فوراً اپنے جوانوں کو پوزیشنیں سنبھالنے کا حکم دیا اور ونگ کمانڈر کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ دیر سکاؤٹس کا ایک جوان پاؤں پر گولیوں کی بوچھاڑ سے شدید زخمی ہو چکا تھا، خون تیزی سے بہہ رہا تھا اور فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ جرأت مند کیپٹن نے اپنے ونگ کمانڈر کو بتایا کہ وہ ذاتی طور پر زخمی سپاہی کو پیچھے لانے کے لئے جا رہا ہے۔ صورتِ حال سے یہ تو آشکار تھا کہ زخمی سپاہی یقیناً دہشت گردوں کی فائرنگ کی زد میں تھا اور انہوں نے اس پر نظر بھی رکھی ہوگی۔ ایسے میں فائرنگ کی سمت پیش قدمی کا فیصلہ صرف کیپٹن حافظ اسلام شہزاد جیسے نڈر اور باہمت آفیسر ہی کر سکتے تھے۔ ونگ کمانڈر نے کپتان کے عزم کو دیکھتے ہوئے ہدایت کی کہ کیپٹن اسلام اور کیپٹن وقاص دونوں ایک دوسرے کی کمک میں دہشت گردوں کے مصدقہ ٹھکانے کی طرف پیش قدمی کریں۔ پرخار اور دشوار گزار پہاڑی پر عمودی سمت میں 20 منٹ کی مسلسل پیش قدمی کے بعد دونوں آفیسرز نے دہشت گردوں کے ٹھکانے کی جانب دو مخالف سمتوں سے پتھروں اور درختوں کی آڑ میں گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ وہ جگہ جہاں سے فائرنگ کی گئی تھی، اب صرف 200 گز کے فاصلے پر تھی اور امکان تھا کہ دہشت گرد بھاگنے کی کوشش کریں گے۔ فائرنگ کے علاقے میں نائب صوبیدار شاہ پسند پہلے ہی آڑ لے کر پوزیشن سنبھالے ہوئے تھے۔ صوبیدار شاہ پسند نے ہی بتایا تھا کہ اپنے تین لوگوں کو گولیاں لگی تھیں جن میں ایک جونئر کمیشنڈ آفیسر بھی شامل تھے۔ زخمی سپاہی شاہد (جو بعد میں شہادت کا درجہ پا گیا) چیخ چیخ کر دہشت گردوں کے مقام کی نشاندہی کر رہا تھا۔ دوسرے دو زخمیوں میں صوبیدار شاہ زمان اور سپاہی آفتاب تھے جو بعد میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر گئے۔

اب کیپٹن حافظ اسلام شہزاد اور کیپٹن وقاص نے اپنے ونگ کمانڈر اور کمانڈنٹ کو اعتماد میں لیتے ہوئے دہشت گردوں کے گڑھ پر فیصلہ کن ہلہ بولنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ زمین کے نشیب و فراز

اور نقل وحرکت کی دشواری کا اندازہ کرتے ہوئے دونوں آفیسرز نے صرف 5-5 جوانوں کے گروپ کو ساتھ لیا اور بالائی سمت سے اپنے ہدف سے قریب تر ہونے لگے۔ یہ کوئی ایک بجے کا وقت تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دہشت گردوں کی طرف سے شدید فائرنگ ہونے لگی۔ کیپٹن اسلام شہزاد ہراول گروپ کی قیادت کر رہے تھے جبکہ دوسری سمت سے کیپٹن وقاص کا گروپ ہدف کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں ونگ کمانڈر نے بھی سپیشل آپریشن گروپ کمپنی کے ہمراہ بروقت کمک پہنچانے کے لئے پیش قدمی کا آغاز کر دیا تھا۔ کیپٹن وقاص اور کیپٹن اسلام کو اب شدید مزاحمت کا سامنا تھا۔ فائرنگ کے اس شدید تبادلے میں کیپٹن اسلام شہزاد بائیں جانب سے ہوتے ہوئے ہدف کے انتہائی قریب پہنچ گئے تھے۔ کیپٹن وقاص بھی بلا تامل دہشت گردوں کے گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ ونگ کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل محمد افراز اسلم اب ایسے مقام تک پہنچ چکے تھے جہاں سے وہ اپنے دونوں ہراول دستوں کو دیکھ سکتے تھے۔ البتہ دہشت گرد ایسے انداز میں مورچہ بند تھے کہ انہیں براہ راست دیکھنا دشوار تھا۔ ہراول دستوں کا ہدف سے فاصلہ اب 25 میٹر سے بھی کم تھا۔

کیپٹن اسلام شہزاد اور ان کے ساتھی اب دہشت گردوں کی گردن دبوچنے کے لئے بیتاب تھے۔ کیپٹن اسلام شہزاد کو نجانے کب سے اس لمحے کا انتظار تھا، وہ ایک حافظِ قرآن تھے اور انھیں اس بات کا شدید دکھ تھا کہ دہشت گردوں نے کس طرح اسلام، مدرسے اور جہاد کے نام کو بدنام کیا تھا۔ کیپٹن اسلام شہزاد کو عرصے سے اس لمحے کا انتظار تھا کہ جب ایسے خارجی اور منافق کی گردن ان کے ہاتھوں کی گرفت میں ہو اور وہ اسے بتائیں کہ اللہ کی راہ میں لڑنے اور زمین میں فتنہ وفساد بپا کرنے میں کیا فرق ہے!

حافظ اسلام شہزاد دراصل مادرِ وطن کا ایک ایسا ہونہار اور تابع فرمان بیٹا تھا جس نے نو سال تک وطنِ عزیز کی خدمت بطور سپاہی انجام دینے کے بعد تین سال قبل بطور کیپٹن کمیشن حاصل کیا تھا۔ اسلام شہزاد کے والد فضل الٰہی نے سال ہا سال کی مزدوری کے بعد اپنے بیٹے کے کندھے پر

سجے پھول دیکھے تو خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ان کے حافظ بیٹے کیپٹن اسلام شہزاد نے کمیشن حاصل کرنے کے بعد بوڑھے باپ کو جسمانی مشقت سے منع کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب وہ اپنے والد کی جی بھر کے خدمت کرنا چاہتے ہیں اور چند ماہ قبل گھر ملنے پر انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ماں کا سایہ تو آٹھ سال پہلے سر سے اٹھ گیا تھا۔تب وہ ایک سپاہی تھے۔سن 2000 میں میٹرک کیا تو سب سے پہلے علاقے کے قاری دلاور مفتی کی شاگردی میں ایک سال سے کم عرصے میں حفظ کی منازل طے کر کے اپنے سینے میں قرآن حکیم کے نور کو محفوظ کیا اور پھر اپنے غریب باپ کی مشقت دیکھتے ہوئے بطور سپاہی فوج میں بھرتی ہو گئے۔

بنیادی تربیت مکمل کر کے پاک فوج کی مایہ ناز یونٹ 28 میڈیم رجمنٹ آرٹلری میں پہنچے تو بطور سپاہی ایسے باکمال ٹھہرے کہ ہر کوئی رشک کرے، آفیسرز اور جوان سبھی ان کے گرویدہ تھے۔ہر فن مولا اور ہر کام میں پیش پیش! فائرنگ کا مقابلہ ہو یا دیگر تربیتی سرگرمیاں، وہ ایک وقت میں بہترین نشانہ باز، اپنی یونٹ کے مقابلوں میں ہمیشہ اول، مسجد میں تراویح کی نماز پڑھانی ہو تو پیش امام، جب ڈیوٹی سے فراغت ملتی تو رات رات بھر تعلیم کے مدارج طے کرتے۔ 2007 میں جب والدہ بھی چل بسیں تو اسلام شہزاد کی سنجیدگی مزید بڑھ گئی۔تعلیم مکمل کی اور جب پاک فوج نے ایک موقع فراہم کیا تو 23 اکتوبر 2011 میں بطور کمیشنڈ آفیسر فرنٹیئر کور خیبر پختونخوا میں جا پہنچے۔ان کی پہلی تعیناتی ٹوچی سکاؤٹس میں تھی جبکہ اکتوبر 2013 میں ان کی پوسٹنگ دیر سکاؤٹس میں ہو گئی۔شہادت کے عظیم مرتبے تک پہنچنے کا وقت آیا تو وہ دیر سکاؤٹس کے 181 ونگ زیرِ کمان باجوڑ سکاؤٹس میں بطور ونگ ایڈجوٹنٹ اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ 2007 میں اُن کی ماں نے اپنی زندگی میں بڑے ارمانوں سے اپنے بیٹے کا نکاح اپنی بھانجی گلشن نورین سے کرا دیا تھا لیکن ابھی رخصتی کرا کے بہو کو گھر نہ لا سکی تھیں کہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

ماں نے اپنے بیٹے کے سر پہ سہرا سجا دیکھا تھا نہ اس کے کندھے پر چمکتے ستارے!

19 جنوری 2015 کی صبح 5 بجے کیپٹن حافظ اسلام شہزاد نے دھیرے سے ابا کے

کمرے میں جھانک کر پوچھا، ابا جی کیا آپ جاگ رہے ہیں؟ خلافِ معمول کیپٹن اسلام شہزاد نے انہیں ایک چٹ پکڑاتے ہوئے مطلع کیا کہ ان کے ذمے آفیسرز میس کے 25ہزار روپے واجب الادا ہیں جو انہوں نے بطورِ قرض لئے تھے۔ ابا خاموش رہے۔ بیٹا جب راہ عدم کو سدھار رہا ہو تو باپ بھلا کیسے سو سکتا تھا، بے تابی میں اٹھ کر بیٹھ گئے اور بس خالی خالی نظروں سے بیٹے کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے، البتہ زیرِ لب ڈھیروں دعائیں تھیں جو ہر سانس میں بیٹے کی سلامتی و ثابت قدمی کے لئے جاری رہتی تھیں۔ کیپٹن حافظ اسلام نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد اپنے مشن کے لئے روانہ ہو گئے۔ دراصل آج وہ والد کی شفقت سمیٹ کر کسی بہت بڑے کام کے لئے عازمِ سفر ہوئے تھے۔۔۔ اور اب دس گھنٹے کی تگ و دو کے بعد وہ منزل سامنے تھی۔ وہ پاکستان اور انسانیت کے دشمنوں کو بہ نفسِ نفیس جہنم واصل کرنے والے تھے۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے تعلق رکھنے والے کیپٹن سید وقاص سمیع اس مرحلے پر ان کے شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ دونوں آفیسرز نے اپنے جوانوں کے ہمراہ دہشت گردوں کے گڑھ پر ہلہ بول دیا۔ کیپٹن اسلام اپنے جوانوں کی قیادت کرتے ہوئے سب سے پہلے ہدف پر جھپٹے۔ ایسے میں کیپٹن سید وقاص سمیع نے اسلام شہزاد کو قدرے احتیاط برتنے کا مشورہ بھی دیا کیونکہ دہشت گردوں کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ انتہائی شدید تھی۔ لیکن کیپٹن اسلام شہزاد نے دہشت گردوں کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے کسی بھی قربانی سے دریغ کرنے کو تیار نہ تھے۔ یہ الگ بات کہ خود کیپٹن وقاص نے بھاگتے ہوئے دہشت گردوں کے تعاقب میں کوئی 20 فٹ گہرے نالے میں چھلانگ لگا دی تھی جس سے ان کی ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کو ناقابلِ تلافی نقصان بھی پہنچا۔ ادھر کیپٹن اسلام دستی بموں اور مشین گن سے آگ برساتے ہوئے دہشت گردوں کے سر پر پہنچ گئے تھے۔ وہ انسانیت کے ان دشمنوں کو انھیں کے مورچوں میں نشانہ بنا رہے تھے۔ عین اسی لمحے دہشت گردوں کے ایک چھپے ہوئے سنائپر نے ہراول دستے کے پرجوش اور بپھرے ہوئے شیر کو تاک کر پیشانی پر نشانہ لگایا۔ یوں جامِ شہادت نوش کرتے ہوئے اللہ کے اس شیر کی آخری جست

بھی دہشت گردوں کی کمین گاہ کے دہانے پر تھی ۔کلمۂ شہادت کے ورد میں رطب اللسان کیپٹن حافظ اسلام شہزاد شہید کی دیرینہ خواہش کی تکمیل ہو چکی تھی ۔وہ شہادت کے عظیم مقام پر فائز ہو چکے تھے۔

کیپٹن حافظ اسلام شہزاد اور ان کے ساتھیوں کی قربانی سے دہشت گردوں کا زور ٹوٹ چکا تھا لیکن ان قربانیوں کا اصل ثمر صرف علاقے کی مکمل صفائی کی صورت میں ہی ممکن تھا۔شام کی روشنی رفتہ رفتہ ماند پڑ رہی تھی، دہشت گردوں کے علاقے سے ابھی تک کیپٹن حافظ اسلام شہزاد شہید، نائب صوبیدار شاہ زمان شہید اور سگنل مین شاہد شہید کے اجسادِ خاکی اٹھانا باقی تھے اور زخموں سے چور کیپٹن وقاص سمیع، سپاہی آفتاب اور سپاہی نیک عمل کو بھی بروقت طبی امداد کی ضرورت تھی ۔سپاہی آفتاب کو فوراً اٹھا کر طبی امداد دینا اس لئے بھی ضروری تھا کہ ان کی حالت بہت نازک تھی، دراصل کیپٹن حافظ اسلام شہزاد جب پیشانی پر گولی لگنے سے گرے تو دہشت گردوں کی سراسیمگی ابھی باقی تھی، انھوں نے ایک اور دستی بم زمین پہ پڑے ہوئے شہید پر دے مارا۔اس بم سے قریب کھڑے سپاہی آفتاب کی ران پر ایک بڑا گھاؤ آیا اور تیزی سے خون بہنے لگا۔

ونگ کمانڈر ریفٹیننٹ کرنل محمد افراز اسلم جو براہِ راست آپریشن کی کمان کر رہے تھے اس ساری صورتِ حال سے پل پل آگاہ تھے۔اب ایک طرف تو سورج غروب ہونے کو تھا اور دوسری طرف دہشت گردوں کی غیر انسانی اور اخلاقیات سے گری ہوئی روایات کا ادراک بھی ونگ کمانڈر کی فکرمندی کا باعث تھا، جس کے مطابق وہ شہید کے جسدِ خاکی کی بے حرمتی کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔وقت بہت کم تھا۔ونگ کمانڈر ریفٹیننٹ کرنل محمد افراز اسلم نے اس موقع پر ترجیحات کے تعین میں کوئی بھی لمحہ ضائع کئے بغیر سپیشل آپریشن گروپ کمپنی کے میجر احسان اور کیپٹن علی رضا کے ساتھ دہشت گردوں کی آماجگاہ پر ایک بھرپور یلغار کا فیصلہ کیا۔اس حملے میں ونگ کمانڈر ریفٹیننٹ کرنل محمد افراز اسلم اور میجر احسان نے خود راکٹ لانچر اپنے کندھوں پر لئے اور گولے داغتے ہوئے دہشت گردوں کے بنکروں پر چڑھ دوڑے۔چند ہی منٹ میں انھوں نے

ایک ایک دہشت گرد کا چن چن کر صفایا کیا اور اپنے غازیوں اور شہیدوں کو پورے عزت واحترام سے محفوظ مقام پر پہنچایا۔ واپس پہنچتے ہی شہدا، کو فوری طور پر سبز ہلالی پرچم کے لبادے میں ان کے آبائی شہروں کی طرف پورے تزک واحتشام سے روانہ کیا گیا اور زخمیوں کو طبی امداد کے لئے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال پشاور روانہ کر دیا گیا۔

ڈھیرئی بانڈہ کا علاقہ اب پرامن شہریوں کے لئے محفوظ بن چکا تھا۔ جبکہ محلہ مفتیاں دینہ کے ہر بڑے، بوڑھے، بچے اور جوان کی آنکھیں اور سر فخر سے بلند تھا۔ ان کا اپنا ہم جولی، ہم پیالہ وہم نوالہ غریبوں میں غریب، حافظوں، نمازیوں اور ریڑھی بانوں کا دوست اور اہل محلہ کی آنکھوں کا تارا آج سبز ہلالی پرچم میں عسکری گارڈ آف آنر کے ساتھ محلہ مفتیاں میں پورے جاہ وجلال سے لوٹا تھا۔ پاک فوج کے سپاہیوں کو فخر تھا کہ ان کا ساتھی کمیشن حاصل کرنے کے بعد شہادت جیسے عظیم رتبے پر پہنچ کر تمام سولجرز کے لئے ماتھے کا جھومر ثابت ہوا تھا۔ بہنیں اور بھائی اپنے بھائی کی شان وشوکت دیکھ کر پھولے نہیں سماتے، شہید کی اہلیہ کے سامنے اگرچہ پہاڑ جیسی زندگی ایک امتحان کی طرح کھڑی ہے لیکن انھیں اپنے شہید رفیق حیات کے نصب العین کی لاج رکھنے کا ادراک ہے۔ چار سالہ حفصہ نور کو شہید کی بیٹی ہونے پر فخر ہے اور تین سالہ محمد حسان کل باپ کے نقش قدم پر چل کر وطن کے تحفظ کی قسم کھا رہا ہے اور باپ کو ناز ہے کہ ان کے بیٹے نے انہیں ایک رکشہ ڈرائیور سے شہید کے والد کے مقام پر فائز کر دیا ہے۔

*****

لہو کا خراج

میجر ارمغان نعیم

......•••......

میجر خالد عزیز شہید کی شہادت کو آٹھ برس بیت چکے ہیں مگر اس کے باوجود بھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی عادت کے مطابق اچانک کسی جانب سے آ نکلے گا یا پھر ابھی ابھی میرے موبائل فون کی گھنٹی بجے گی اور دوسری طرف خالد بول رہا ہوگا۔ ''میں اپنے ملک پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا، چاہے اس میں میری زندگی کو خطرہ ہی کیوں نہ ہو۔''

یہ اپریل 1993 کا ایک دن تھا۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول کے میدان میں 87 ویں لانگ کورس کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کے موقع پر تھرڈ پاکستان بٹالین کی حیدر کمپنی کے دستے کی صفِ اول میں موجود خالد عزیز اس پریڈ کا حصہ تھا۔ اس کے ذہن میں ٹریننگ کے سخت دنوں کی یادیں اور مستقبل کے سنہرے خواب گھوم رہے تھے۔ وہ ہر نئے پاس آؤٹ ہونے والے کیڈٹ کی طرح آنے والے دنوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ادھر مہمانوں کے پنڈال میں تشریف فرما خالد عزیز کے والدِ محترم کرنل عزیز الرشید اپنے بیٹے کی فوجی ٹریننگ مکمل کر کے بحیثیت افسر فوج میں کمیشن حاصل کرنے پر شاداں و فرحاں تھے۔ خالد عزیز نے اپنی محنت سے اچھا مقام حاصل کر کے اپنا اور اپنے خاندان کا نام روشن کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے چھوٹے بھائیوں کے لئے بھی یقیناً ایک اچھی روائت قائم کی تھی۔

صوبہ خیبر پختون خوا کے ضلع بنیر سے تعلق رکھنے والے خالد عزیز کو 35 آزاد کشمیر رجمنٹ میں تعینات کیا گیا تھا۔ اپنی ذہانت اور قابلیت کے باعث جلد ہی خالد عزیز نے اپنی بٹالین میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ ٹریننگ، سپورٹس، ایڈم سمیت ہر میدان میں خالد عزیز نے اپنا نام بنایا اور عزت کمائی۔ ایک مرتبہ فوجی زندگی نے پھر سے مجھے اور خالد عزیز کو یکجا کر دیا جب ہم دونوں انفنٹری سکول (School of Infantry & Tactics) کوئٹہ میں کورس کے لئے اکٹھے ہوئے۔ اکثر کوئٹہ کی یخ بستہ صبح کو میں اور خالد سائیکلوں پر سوار ہو کر ٹریننگ ایریا کی جانب روانہ ہوتے۔ ایک ایسی ہی صبح ہم دیوقامت انفینٹری مین کے مجسمے کے سامنے سے گزرے جو دراصل شہداء کی یادگار ہے، جس کے برابر میں یہ لازوال اشعار جلی حروف میں کندہ ہیں:

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دونیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

خالد چلتے چلتے رک کر ان اشعار کو پڑھنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ بولا کہ واقعی، شہادت سے بڑھ کر کوئی اور مقام نہیں ہے۔ اگر یہ مقام انسان کو مل جائے تو پھر اسے اور کسی چیز کی خواہش نہیں رہ جاتی۔ اس وقت میں اور خالد دونوں اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے خالد کو اسی عظیم مقام کے لئے چن لیا ہے جس کی وہ دل ہی دل میں خواہش کر رہا تھا۔

نومبر 1997 میں خالد سپیشل سروسز گروپ (SSG) کا حصہ بن گیا۔ ٹریننگ کی سختیاں اٹھانے کے بعد وہ اسپیشل فورسز کا ایک انتہائی فعال کارکن بن کر ابھرا۔ اس کی عمدہ کارکردگی کے پیشِ نظر اس کو اسپیشل فورسز ٹریننگ اسکول میں، بحیثیت معلم و ٹریننگ افسر، تعینات کر دیا گیا۔ سپیشل

فورسز کے کمانڈوز کی ٹریننگ کرنا ایک انتہائی اہم اور بھاری ذمہ داری تھی جو خالدعزیز نے اعلیٰ افسروں کی توقعات سے بڑھ کرنہایت احسن طریقے سے انجام دی۔ اپنی بے مثال کارکردگی اور اولین احساسِ ذمہ داری کے باعث خالدعزیز کو دیگر بہت سی حساس نوعیت کی ذمہ داریاں سونپی گئیں جو اس نے ہمیشہ بطریقِ احسن نبھائیں۔

خالدعزیز کو بحیثیت سپیشل فورس اسکواڈ کمانڈر اقوامِ متحدہ کی امن فوج کے پاکستانی دستے کے ساتھ افریقہ کے ملک برونڈی بھیجا گیا۔ اس ڈیوٹی کے دوران بھی خالدعزیز نے پاکستان اور پاکستان آرمی کا نام خوب روشن کیا۔ وطن واپسی پر خالدعزیز کی تعیناتی 2 کمانڈو بٹالین میں کر دی گئی۔ اس دوران خالدعزیز کے ساتھ رابطہ برقرار رہا۔ خالدعزیز کے چھوٹے بھائی شاہد نے میری یونٹ (11 فرنٹیئر فورس رجمنٹ) میں بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ شمولیت اختیار کر لی۔ جب بھی خالدعزیز اپنے بھائی سے ملنے میری یونٹ میں آتے، خوب محفل جمتی اور گپ شپ کے ساتھ پرانے قصے دہرائے جاتے۔ اپنے بڑے بھائی کی طرح، شاہدعزیز بھی ایک نہائت محنتی اور ذمہ دار افسر تھا۔

وطنِ عزیز میں دہشت گردوں کی شرپسندانہ کارروائیاں جب حد سے بڑھ گئیں تو ان ملک دشمنوں کی سرکوبی کا منصوبہ بنایا گیا۔ یہ وہ دور تھا جب ملک کے طول وعرض میں دہشت گردی کی کارروائیاں ہورہی تھیں۔ شمال مغربی قبائلی علاقے بالعموم اور بلوچستان کے کچھ علاقے بالخصوص ان دہشت گردوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ بلوچستان کے ضلع کوہلو سے کچھ فاصلے پر کوہِ سلیمان کے پہاڑی سلسلے میں دہشت گردوں کی بھاری اسلحے کے ساتھ موجودگی کی مصدقہ اطلاعات متواتر موصول ہورہی تھیں۔ ایس ایس جی اور ایف سی بلوچستان کے ایک مشترکہ آپریشن کے ذریعے دہشت گردوں کے ان ٹھکانوں کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس مشن کے لئے خالدعزیز کی یونٹ، 2 کمانڈو بٹالین کا انتخاب کیا گیا جو عرفِ عام میں ''رہبر بٹالین'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ رہبر بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل عامر حمید اعوان نے میجر خالد

عزیز اور کیپٹن ضمیر عباس کو تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے منصوبہ بندی کرنے کو کہا۔ خالد عزیز اور ضمیر عباس نے مل کر ایک بھرپور منصوبہ بنایا۔ چند معمولی تبدیلیوں کے بعد کرنل عامر نے اس منصوبے کو منظور کرتے ہوئے اس پر عمل کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ یوں رہبر بٹالین کے جانباز اپنے ہدف کی جانب روانہ ہو گئے۔

چونکہ اس مقام تک زمینی راستے سے بروقت رسائی ممکن نہ تھی اس لئے خالد عزیز اور اس کی ٹیم کو اپنے ہدف سے پانچ کلومیٹر دور بذریعہ ہیلی کاپٹر اتارا گیا۔ یہ پہاڑوں کے درمیان چھپا ہوا نہائت محفوظ مقام تھا، جہاں دشمن کی نظر میں آئے بغیر پہنچنا تقریباً ناممکن تھا۔ خالد عزیز اور ضمیر عباس نے دو مختلف سمتوں یعنی مغربی اور مشرقی اطراف سے نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنے ہدف کی جانب پیش قدمی کا آغاز کیا۔ دونوں ٹیموں کو دشمن کی طرف سے شدید فائر کا سامنا تھا۔ دشمن گرینیڈ، راکٹ لانچر اور مشین گنوں کا بے دریغ استعمال کر رہا تھا۔ خالد عزیز کی پارٹی جب دشمن کے قریب پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ ان کے سامنے ایک بہت بڑا پہاڑی نالہ موجود تھا جسے عبور کئے بغیر وہ اپنے ہدف تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ یہاں ان کا سامنا دشمن کے ایک ٹولے سے ہوا جس نے خالد کی پارٹی پر فائر کھول دیا۔ خالد کے ساتھیوں نے ان دہشت گردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ایک کو زندہ بھی پکڑ لیا مگر اس دوران نائب صوبیدار محمد صابر جامِ شہادت نوش کر گئے۔ پکڑے جانے والے دہشت گرد سے حاصل شدہ معلومات سے یہ پتا چلا کہ اس مقام پر چند بہت بڑے دہشت گرد موجود ہیں۔ خالد نے اپنی پیش قدمی مزید جاری رکھی۔ جلد ہی خالد اور اس کے ساتھیوں نے سات مزید دہشت گردوں کو قابو کر لیا۔ اسی دوران خالد کے ایک ساتھی نائیک محمد اسلم دشمن کی گولی لگنے سے زخمی ہو گئے۔ خالد عزیز نے اسلم کو سنبھالا اور ابتدائی طبی امداد مہیا کی۔ مگر کچھ ہی دیر میں نائیک محمد اسلم نے بھی اپنی جان کی قربانی پیش کر دی۔ اب تو خالد عزیز نے ہر قیمت پر اس مقام کو تباہ کرنے کا مکمل ارادہ کر لیا۔

دوسری جانب سے کیپٹن ضمیر کی پارٹی بھی دشمن کا بھرپور مقابلہ کر رہی تھی۔ اسی فائر کے

تبادلے کے دوران، راکٹ لانچر کا ایک گولہ کیپٹن ضمیر کے قریب آ کر پھٹا جس کے باعث انہوں نے شہادت کا مرتبہ حاصل کرلیا۔ جب خالد اور اس کے ساتھی ہدف کے قریب پہنچے تو اندر چھپے ہوئے دشمن نے ان پر بے تحاشا فائر کھول دیا۔ خالد نے کمال ہوشیاری سے اپنے ساتھیوں کو مختلف سمتوں میں پھیلا دیا اور پھر ہر سمت سے دشمن پر یلغار کر دی۔ یہاں خالد عزیز اور دہشت گردوں کے درمیان شدید فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا۔ خالد عزیز بار بار اپنے لوگوں کی پوزیشن تبدیل کروا کر دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ بالآخر ایک شدید معرکے کے بعد خالد عزیز اور اس کے ساتھیوں نے اپنے ہدف پر موجود دہشت گردوں کا صفایا کر دیا۔ اب اس مقام کو کلیئر کرنا تھا تاکہ اگر کوئی دشمن اندر چھپا ہوا ہو تو اس کا صفایا کیا جا سکے۔ جب خالد عزیز اور ان کے ساتھی اندر داخل ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ تمام نامی گرامی دہشت گرد مارے جا چکے تھے۔ یہ پہاڑ کے اندر غاروں کا ایک سلسلہ تھا جہاں دہشت گردوں نے ساز و سامان اور گولہ بارود کا وسیع ذخیرہ جمع کیا ہوا تھا۔

خالد عزیز اور ان کے ساتھی اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھے کہ دشمن نے مرنے سے پہلے غاروں کے اندر بارودی سرنگیں نصب کر دی ہیں۔ چونکہ خالد عزیز کو ہمیشہ سے پہل کرنے کی عادت تھی اسی وجہ سے وہ بذاتِ خود ہر غار کو خود کلیئر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک ایک مقام پر چھپی ہوئی بارودی سرنگ نے اپنا کام کر دکھایا۔ ایک دھماکہ ہوا اور خالد عزیز نے جامِ شہادت نوش کرلیا۔ شہادت کا مقام حاصل کرنے سے قبل خالد عزیز نے نہ صرف ایک مشکل ترین ہدف کو تباہ کر دیا، بلکہ وہاں موجود مطلوب دہشت گردوں کا صفایا بھی کر دیا تھا۔

اس عظیم کارنامے کو دلیری اور شجاعت کے ساتھ انجام دینے پر خالد عزیز کو پاک فوج نے ستارہ بسالت (بعد از شہادت) کے اعلیٰ اعزاز سے نوازا۔ خالد عزیز ایک ایسا دلیر مجاہد تھا جو کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی ابتدائی اٹھان سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑا مقام حاصل کریں گے۔ خالد عزیز کے والد کرنل عزیز الرشید کو اپنے بیٹے کے اس عظیم کارنامے پر فخر

ہے۔ خالدعزیز کے چھوٹے بھائی شاہدعزیز نے بڑے بھائی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے سپیشل سروسز گروپ (SSG) میں شمولیت اختیار کی۔شاہدعزیز اپنے بھائی سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ اسپیشل فورسز کے ارکان بھی شاہدعزیز کو خالدعزیز شہید کا بھائی ہونے کے ناتے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

شہادت سے چندروز قبل خالد ایک سرکاری ڈیوٹی کے سلسلے میں میرے پاس آیا۔ میں اور خالد تقریباً پوری رات پرانے واقعات یاد کر کے گپ شپ لگاتے رہے۔ دورانِ گفتگو میں نے محسوس کیا کہ خالد بات کرتے کرتے اچانک کچھ گم سا ہوجاتا تھا۔ یہ ایک یادگار ملاقات تھی کیونکہ اگلی صبح جب میں نے خالد کو رخصت کیا تو مجھے بالکل علم نہ تھا کہ اس کے بعد میری اور خالد کی کبھی ملاقات نہ ہوگی۔ خالدعزیز کے بھائیوں، میجر شاہدعزیز اور میجر عابدعزیز دونوں کی یہی خواہش ہے کہ انہیں بھی وطنِ عزیز کی خاطر جاں نثاری کا کوئی موقع میسر آئے تو وہ ملک وقوم کو مایوس نہیں کریں گے۔سلام ہے خالدعزیز شہید اور اس کے پورے خاندان کو جن کے لئے ایک شہادت، صرف شہادت نہیں بلکہ دوسروں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

*****

وہ جو راہِ حق کے مسافر ہوئے

عائشہ طیب

...... ••• ......

26 ستمبر 2008 جمعۃ المبارک اور ماہ رمضان عام لوگوں کے لئے محض ایک تاریخ ہے جو آئی اور گزر گئی مگر ہمارے لئے اس کے معانی بہت کٹھن اور انمٹ ہیں کہ یہ ایسا دن اور ایسی تاریخ ثابت ہوئی، جس نے ہمارے زندگی کا رخ ہی موڑ دیا۔میرے لئے 26 ستمبر عام دن نہیں۔یہ وہ دن ہے جس دن میرے ہم سفر طیب نے جامِ شہادت نوش کیا۔ان کی شہادت برحق ہے۔ وہ تو اس عظیم مرتبے پر فائز ہو گئے کہ ہم ان کی شہادت پر رشک کرتے ہیں۔لیکن آنکھ کا اشک بار ہونا ایک فطری عمل ہے۔ان کی شہادت بھی ایک حقیقت ہے مگر اس دل کا کیا کیجئے جو مانتا ہی نہیں کہ ہم اس ہستی سے محروم ہو گئے ہیں جو انتہائی شفیق ملنسار اور پیار کرنے والی تھی۔فاطمہ اور عنائیہ (وہ بیٹی جو دنیا میں ان کی شہادت کے بعد آئی) نہیں جانتیں کہ باپ کی شفقت کسے کہتے ہیں اور باپ کیسا ہوتا ہے۔ان کے وہم و گمان میں بھی وہ الفت نہ ہوگی جو باپ اپنی بیٹیوں سے کرتے ہیں۔مگر نہیں ان کا باپ زندہ ہے کہ وہ شہید ہے۔ہمیں شعور بھلے نہ ہو مگر حق یہی ہے کہ وہ امر ہے۔

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں ان کا شعور نہیں۔ (سورالبقرہ آیت 154)

طیب عزیز اپنے نام کی تفسیر اور اپنوں کا عزیز اور پیارا تھا اور ہمیشہ رہے گا۔

طیب 12 مارچ 1977 کو باغ آزاد کشمیر کے ایک فوجی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان

کے والد کرنل محمد عزیز خان بھی ایک فوجی افسر تھے جوان کے بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے۔ ہر فوجی گھرانے کی روایت کی طرح ان کے بڑے (مرحوم) بھائی کی شدید خواہش تھی کہ طیب بھی آرمی آفیسر بنیں۔طیب نے بھی انتہائی جانفشانی اور محنت سے ان کی اس آرزو کو پورا کرنے کے لئے دن رات محنت کی اور برن ہال سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان ملٹری اکیڈمی کے لئے منتخب ہوگئے۔پاسنگ آؤٹ کا دن والدہ اور گھر والوں کے لئے باعثِ فخر تھا۔طیب نے پاس آؤٹ ہونے کے بعد اپنے والد کی پیروی کرتے ہوئے ان کی یونٹ 10 اے کے رجمنٹ جوائن کی جوان ایام میں بجوات سیکٹر میں تعینات تھی۔ان دنوں دشمن کے تیور کافی بگڑے ہوئے تھے اور گولہ باری روزانہ کا معمول تھا۔یوں آغاز سے ہی وہ معرکہ حق و باطل میں حصہ دار بنے اور اپنی یونٹ کے ساتھ دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

اپنی عسکری زندگی کے آغاز سے ہی طیب انتہائی جاں فشانی سے اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں مصروف رہے۔ 2004 تک اپنی یونٹ کے ساتھ بنوں عاقل میں بھی رہے۔بعد ازاں 2 سال کی مدت کے لئے یو این مشن کے ساتھ لائبیریا میں تعینات رہے۔اسی دوران اکتوبر 2005 میں جب قیامت خیز زلزلہ آیا تو آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے کی بنا پر رخصت پر واپس آئے۔ان دنوں 10 اے کے رجمنٹ ریلیف ورک کا حصہ تھی۔چنانچہ طیب نے بھی امدادی کارروائیوں میں دن رات ایک کر کے اپنے لوگوں سے تعلق کا حق صحیح معنوں میں ادا کیا جس کا ثبوت ان کی شہادت پر ان تمام دور دراز کے رہائشی لوگوں کا اجتماع تھا جو اپنے سپوت کو آخری نذرانہ پیش کرنے اور ان کا آخری دیدار کرنے کے لئے ان کا جسدِ خاکی باغ پہنچنے سے پہلے موجود تھے۔

2006 میں ان کی پوسٹنگ سکول آف انفینٹری اینڈ ٹیکٹکس کوئٹہ میں بطور انسٹرکٹر ہوئی۔ جہاں سے ان کو اکتوبر 2007 میں یونٹ کے ساتھ بنوں پوسٹ کیا گیا جوان کے فوجی کیریئر کی آخری پوسٹنگ ثابت ہوئی۔وہیں سے باجوڑ آپریشن کے لئے روانہ ہوئے اور ایسے گئے کہ جامِ

شہادت نوش کر کے ہی پلٹے ۔ باجوڑ میں لوئی سم وہ مقام ہے جہاں انہوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔اس مقام پر ان سے منسوب ایک چیک پوسٹ ہے۔جس دن سے طیب باجوڑ کے لئے بنوں سے روانہ ہوئے اس دن سے کسی لمحہ قرار نہ تھا۔ہر رات ان کی خیریت کے فون کا انتظار اور پھر فون کے بعد چند لمحوں کا قرار اور پھر سارا دن اگلی کال کا انتظار جو بالآخر 25 ستمبر 2009 بمطابق 25 رمضان المبارک کے افطار سے کچھ دیر پہلے ان کی شہادت کی اطلاع پر اختتام پذیر ہوا۔

طیب شہید کا رتبہ بلند،ان کا مقام اعلیٰ ہے یہی ایک سوچ ہے جو ہمیں حوصلہ دیتی ہے کہ آنسو نہ بہائیں ۔یہی وجہ تھی کہ شہادت پہ نہ کسی کو بین کرنے دیا اور نہ زور سے رونے دیا کہ یہ رتبہ ہر کسی کا مقدر نہیں۔اسی سوچ نے ہر مشکل گھڑی میں کھڑے رہنے اور ہمت نہ ہارنے کا حوصلہ دیا۔ہر لمحہ جب ان کی اشد ضرورت محسوس ہوئی تو اسی جذبے سے دل کی ڈھارس بندھی کہ ہم شہداء کے وارث ہیں اور یہ رتبہ بھی متقاضی ہے کہ ہم اپنے شہید کی طرح مسائل اور مشکلات کے آگے ڈٹ جائیں جیسے وہ دشمنوں کے آگے سینہ سپر ہوئے۔طیب کی شہادت کے بعد 2010 میں انہیں حکومت کی طرف سے ستارہ بسالت سے نوازا گیا۔جو ہم سب کے لئے عزت ووقار کا باعث ہے۔

*****

ایک فضائی محافظ

محمد شاہد

.....◆◆◆.....

ضلع کوٹلی آزاد کشمیر کا ایک ایسا علاقہ ہے جو اپنی زرخیزی میں بے مثال ہے جس کی مٹی سونا، اور پانی امرت ہے۔ جہاں آج بھی زعفران کاشت کیا جاتا ہے اور جس کے نظاروں میں شادابی اور وسعت ہے۔اسی سرزمین پر 24 جنوری 1985 کو راجہ کرم داد کے گھر ایک بچے کی پیدائش ہوئی جس کا نام راجہ تنویر احمد رکھا گیا۔کون جانتا تھا کہ راجہ کرم داد کے غریب سے گھرانے میں پیدا ہونے والا یہ بچہ آنے والے دنوں میں محنت کے مل بوتے پر پاک فضائیہ میں ایک پائلٹ کی حیثیت سے شامل ہوگا اور پاک سرزمین کی فضاؤں کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان جانِ آفرین کے حوالے کر کے جام شہادت نوش کرے گا۔

راجہ تنویر کو بچپن ہی سے جہازوں سے خاص لگن تھی اس شوق کی تسکین کے لئے وہ کاغذ کے ایف سولہ اور میراج طیارے بناتے اور جو انہیں پسند آتا اپنے سٹڈی روم میں رکھ لیتے۔کاغذ کے ایف سولہ بنانے کے شوق نے انہیں JF-17 تھنڈر چلانا سکھایا اور وہ ایک بہترین پائلٹ بن کر ابھرے۔ایف ایس سی تک کی تعلیم کشمیر سے ہی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنے بچپن کے شوق کے حصول کے لئے پاک فضائیہ کا رخ کیا۔

راجہ تنویر احمد نے اپریل 2003 میں پاک فضائیہ میں بطور پائلٹ آفیسر شمولیت اختیار کی اور ملک اور قوم کی خدمت کو اپنا شعار بنایا۔یہ داستان ایک بہادر اور نڈر آفیسر کی ہے۔جس

نے ابتدائی ٹریننگ میں ہی اعلیٰ انداز سے فضاؤں کو عبور کیا۔ دوران ٹریننگ بے شمار انعامات بھی حاصل کئے۔ رسالپور فضائیہ ٹریننگ سنٹر میں اپنا لوہا منوایا اور 117 جی ڈی پی کورس سے بطور فلائنگ آفیسر نمایاں پوزیشن حاصل کرتے ہوئے پاس آؤٹ ہوئے۔

خدا کی وحدانیت پر یقین رکھنے، شریعت محمدیؐ پر عمل پیرا ہونے اور جذبہ جواں رکھنے والے اس فرزند خاص کی بھی ایسی داستان حیات ہے جس نے اپنے نصب العین کو سامنے رکھتے ہوئے باقاعدہ فلائنگ کا آغاز کیا۔ جذبہ شہادت سے سرشار اس مجاہد ملت نے خوش اسلوبی سے اپنے فرائض عسکری سرانجام دینے شروع کئے۔ راجہ تنویر احمد نے جنگی تدبیروں اور فضاؤں میں قلابازیاں لگانے کی مختلف مہارتیں سیکھیں اور اپنے آپ کو فنی تربیت کے حصول سے مزین کیا تاکہ جب مادر وطن کی سرحدوں کو کوئی خطرہ درپیش ہو تو ملکی فضاؤں کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دے سکے۔

راجہ تنویر احمد پاک فضائیہ کے ایک منجھے ہوئے پائلٹ تھے۔ ترقی کا زینہ چڑھتے ہوئے وہ اب ایک سکواڈرن لیڈر تھے۔ انہوں نے مختلف قسم کی ایکسرسائز میں بھرپور حصہ لیا اور اپنی قابلیت کے بھرپور جوہر دکھائے۔ وہ میراج طیارے سے لے کر JF-17 تھنڈر تک مختلف طیارے ہوا میں اڑانے کی مکمل صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے نیشنل اور انٹرنیشنل لیول پر بہت سے کورسز کئے اور نمایاں پوزیشنز حاصل کیں۔

ایک روز سکواڈرن لیڈر راجہ تنویر احمد معمول کی پرواز پر تھے ان کا میراج طیارہ فضاؤں کا سینہ چیرتا اور بادلوں کے درمیان فراٹے بھرتا ہوا محو پرواز تھا کہ اچانک اس میں فنی خرابی پیدا ہو گئی۔ اس فنی خرابی کو ٹھیک کرنے کے لئے پائلٹ نے سرتوڑ کوشش کی۔ اس بہادر سپوت کے پاس یہ چوائس موجود تھی کہ وقت پر طیارے سے Eject کر جاتا اور اپنی جان بچا لیتا۔ تاہم اس صورت طیارے کے آبادی کے اوپر گرنے کے بہت امکانات تھے اور کئی معصوم جانوں کے ضیاع کا اندیشہ تھا۔ سکواڈرن لیڈر راجہ تنویر کے پاس چند لمحے تھے اور کٹھن فیصلہ۔ اپنی جان کا

بچاؤ تھا یا معصوم جانوں کی حفاظت ۔ پاک افواج کی ٹریننگ اور جذبہ غالب آیا۔فرض کی پکار جیت گئی ۔شہادت کی لگن نے غلبہ پایا اور سکواڈرن لیڈر راجہ تنویر نے آخری لمحے تک جہاز کو قابو کرنے کی اور آبادی سے دور رکھنے کی کوشش جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔آخرکار گڈاب کے مقام پر مسرور بیس سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں کے قریب جا گرا اور سکواڈرن لیڈر راجہ تنویر احمد اپنی زندگی کا سفر مکمل کرتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ۔

سکواڈرن لیڈر راجہ تنویر احمد شہید اکثر اپنے دوستوں سے جہاد کا تذکرہ کرتے تھے اور اپنی زندگی کی ہر خواہش پوری کرنے کے لئے ترجیحاً مجاہدانہ زندگی پسند کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے ان کی خواہش کو پورا کیا اور شہادت کا تحفہ نصیب کیا۔اللہ سبحانہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے ۔آمین! شہید کی فیملی کے لئے خراج تحسین اور ان کی اہلیہ کی بہادری اور جرأت کو سلام جس نے کم عمری میں یہ صدمہ برداشت کیا۔

سکواڈرن لیڈر راجہ تنویر احمد شہید کا جسد خاکی سی ۔ 130 پر راولپنڈی چکلالہ ائیر بیس لایا گیا۔ جہاں شہید کی نماز جنازہ ادا کی گئی ۔ان کا جسد خاکی کوٹلی آزاد کشمیر لایا گیا۔کوٹلی میں سول انتظامیہ کی جانب سے جنازہ پڑھانے کا بندوبست کوٹلی شہر کے سب سے بڑے ہوائی گراؤنڈ میں کیا گیا۔کوٹلی آزاد کشمیر میں یہ ایک تاریخی جنازہ تھا جس میں پاک فوج، پاک فضائیہ اور پاک نیوی کی بڑی تعداد کے علاوہ متعدد سیاسی وسماجی شخصیات نے بھی شرکت کی ۔

اس کے بعد شہید کا جسد خاکی ہوائی گراؤنڈ سے آبائی گاؤں ساردہ میں لایا گیا۔جہاں ہر آنکھ اشکبار تھی اور شہید کی روح کو سلام پیش کر رہی تھی ۔پاک فضائیہ کی سپیشل گارڈ نے سلامی پیش کی اور پھر شہید کو لحد میں اتار دیا گیا۔شہادت کے بعد انہیں تمغۂ بسالت کے اعزاز سے نوازا گیا۔

*****

ہے شوق شہادت کس قدر

لیفٹیننٹ عاصمہ ناز

.....◆◆◆.....

چھ ستمبر 2014 کو جب دشمن نے اس ملک کے یوم دفاع پر اس قوم کی غیرت کو للکارا تو وہ شاید یہ بھول گیا تھا کہ یہ دن تو خود اس قوم کے آہنی عزم اور شجاعت کا منہ بولتا ثبوت ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس وطن کے بہادر سپاہی دشمن کو اپنے مذموم عزائم میں کامیاب ہونے دیں گے۔ چھ ستمبر کی صبح جب دہشت گردوں نے پاکستان نیوی ڈاک یارڈ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو محمد ارشاد ایس این اے 4 پیٹی آفیسر آف دی ڈے کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہیں جوں ہی دہشت گردوں کی موجودگی کا علم ہوا، انہوں نے افسران بالا کو مطلع کرنے کے ساتھ ساتھ فوری طور پر ڈیوٹی پر موجود تمام عملے کو ہدایات دینے کا فریضہ بھی انجام دیا۔ انہوں نے کمال فرض شناسی اور چابک دستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بذات خود ہر سنتری کو ہدایات دیں اور جہاں جہاں ممکن تھا خود جا کر صورت حال کا معائنہ کرتے رہے۔ دہشت گردوں کے خلاف آپریشن کے دوران پوری ہمت اور دلیری کے ساتھ اپنا فرض ادا کرتے ہوئے انہوں نے ایسی حکمتِ عملی اپنائی کہ دشمن کو زیادہ حرکت کا موقع نہ ملے اور وہ ڈاک یارڈ کے اہم حصوں کی طرف پیش قدمی نہ کر پائے۔

دشمن کی طرف سے گولیاں اور ہینڈ گرینیڈ فائر ہونے کے باوجود محمد ارشاد اپنے ساتھیوں کی رہنمائی کرتے رہے کیونکہ دشمن کا کوئی بھی ہتھیار ان کے عزم سے زیادہ طاقتور نہیں تھا۔ ان کے بروقت اور دانشمندانہ فیصلوں کی بدولت دہشت گرد ایک جگہ محصور ہو کر رہ گئے اور وہ جس بڑی تباہی

کے عزم سے آئے تھے اس کے بجائے مدافعانہ حکمت عملی اپنانے پر مجبور ہو گئے تاہم انہیں صرف حصار میں لے لینا کافی نہیں تھا۔ دہشت گردوں کی جانب سے اب بھی فائرنگ جاری تھی ۔ اپنے فرض کے احساس اور قومی اثاثوں کے تحفظ کی خاطر محمد ارشاد نے دشمن کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے عزم سے اب جارحانہ حکمت عملی اپنانے کا فیصلہ کیا۔ دشمن کی جانب سے برستی گولیاں ان کے راستے کی دیوار بن سکیں نہ ہی ہینڈ گرینیڈ ان کے بڑھتے قدم روک سکے۔ وہ آگے بڑھتے رہے اور اپنے ساتھیوں کی ہمت بندھاتے رہے۔ ان کے الفاظ اور بلند حوصلہ ان کے ساتھیوں کا خون گرماتے رہے اور وہ وطن عزیز کی حرمت کی خاطر ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ دشمن کی کمین گاہ تک جا پہنچے اور اسی دوران دشمن کی ایک گولی ان کے سر اور دوسری ان کی گردن کو نشانہ بنا گئی لیکن اپنی آخری سانس تک اس ملک کی حفاظت کا حلف اٹھانے والے محمد ارشاد نے اپنا عہد نبھایا اور اس وقت تک اپنے ساتھیوں کو ہدایات دیتے رہے جب تک ان کے جسم میں زندگی کی آخری رمق باقی رہی۔ وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے گر گئے اور دوبارہ اٹھ نہ سکے لیکن ان کی اپنی ڈیوٹی سے لگن اور فرض شناسی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس ہینڈ ہیلڈ ریڈیو پر وہ اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہے تھے، شہادت کے بعد بھی وہ ریڈیو ان کے ہاتھ سے نہیں نکلا۔ ریڈیو پر ان کے ہاتھ کی مضبوط گرفت اس مصمم ارادے اور عزم کا ثبوت تھی جس کی بدولت انہوں نے اپنی جان قربان کر دی لیکن دشمن کے ناپاک ارادوں کو ناکام کر دیا۔ ان کے جرأت مندانہ اقدامات اور بہترین حکمت عملی کی بدولت آپریشن کرنے والی ٹیم نے بہت جلد دہشت گردوں پر قابو پا لیا اور تمام دہشت گردوں کو ان کے منطقی انجام تک پہنچا کر قومی اثاثوں کو کسی بھی قسم کا نقصان نہیں پہنچنے دیا۔

محمد ارشاد مری کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ 7 جنوری 1975 کو پیدا ہونے والے محمد ارشاد چار بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھے لیکن بڑا بیٹا ہونے کے ناتے ہمیشہ اپنے والدین کے لئے سہارا بنے۔ والد کی ملازمت کے باعث ان کی غیر موجودگی میں محمد ارشاد نے

ہمیشہ ایک ذمہ دار بیٹے کی حیثیت سے نہ صرف اپنی والدہ کا ساتھ دیا بلکہ اپنے بہن بھائیوں کے لئے بھی شفیق بھائی کا کردار ادا کیا۔ان کے اہل خانہ کا کہنا ہے کہ جو محبت، رواداری اور حسن اخلاق ان کی شخصیت کا حصہ تھا اس کی بدولت وہ اپنے اقربا میں بے حد مقبول تھے۔ان کی اہلیہ کا کہنا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں گھر کے ایسے سربراہ تھے جن کے بغیر گھر کا تصور ہی محال تھا۔ان کا کہنا ہے کہ ان کی شفقت اور تربیت ان کے بچوں کی شخصیت میں نظر آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ موجود ہیں۔ان کا بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے لیکن اس کے خواب اس کے والد کی طرح بہت بڑے اور ارادے بلند ہیں۔ وہ اس ملک کے ان محافظوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوانے کا خواہاں ہے جن کی عظمت کی داستانیں اس خطے میں نسلوں تک دہرائی جاتی رہیں گی۔

محمد ارشاد کے کمانڈنگ آفیسر کیپٹن ہاشم رضا کا ان کے بارے میں کہنا ہے کہ وہ ایک انتہائی محنتی اور قابل ٹیم ممبر تھے۔ان کے مطابق محمد ارشاد پاک بحریہ کے ہر آفیسر اور سیلر کے لئے عزم و ہمت اور فرض شناسی کی ایک زندہ مثال ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ محمد ارشاد کا ذکر ہر نئے آنے والے سیلر اور آفیسر کے سامنے ضرور کرتے ہیں تاکہ ان کی شخصیت میں بھی وہ اوصاف پیدا ہوں جن کی بدولت محمد ارشاد نے اس ملک کی تاریخ میں اپنا نام سنہری حروف میں لکھوایا۔بحری جہازوں پر موجود کیبن ہمیشہ ایک جیسے نمبروں سے پہچانے جاتے ہیں تاہم محمد ارشاد کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے پاک بحریہ کے ایک جہاز پر سیلر ڈائینگ ہال کا نام محمد ارشاد شہید کے نام پر رکھا گیا ہے تاکہ اس جہاز پر آنے والے ہر سیلر کے سامنے محمد ارشاد کی شجاعت کی مثال ہمیشہ موجود رہے۔

لیفٹیننٹ کمانڈر عاطف جو محمد ارشاد کے ڈویژنل آفیسر بھی رہے، کہتے ہیں کہ محمد ارشاد ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے جونیئرز کے لئے ایک قابل تقلید مثال بن کر کام کرتے ہیں۔محمد ارشاد کبھی اپنے جونیئرز کے ساتھ مل کر کام کرنے سے کتراتے نہیں تھے،ان کے اندر سیکھنے اور کچھ نیا کر دکھانے کا ایک ایسا جذبہ تھا جو انہیں کہیں رکنے نہ دیتا۔وہ ہمیشہ نئے افق کی تلاش میں سرگرداں

رہتے اور خوب سے خوب تر کرنے کی جستجو رکھتے تھے۔انہوں نے محمد ارشاد کی فرض شناسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے فرض پر کسی اور کام کو ترجیح نہ دیتے حتیٰ کہ اپنی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی کے دل کے آپریشن کے وقت بھی جب انہیں بیٹی اور فرض میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا تو انہوں نے بیٹی کے آپریشن میں تاخیر گوارا کرلی مگر فرض کو ترجیح دی۔محمد ارشاد کے سینئر افسران کے مطابق وہ پاک بحریہ کا ایک اہم اثاثہ تھے۔پاک بحریہ کا ہر شخص محمد ارشاد کا مقروض اور شکر گزار ہے کہ انہوں نے اپنی جان کی قربانی دے کر نہ صرف قومی اثاثوں کا تحفظ کیا بلکہ اس ملک کو ایک بڑی تباہی سے بھی بچالیا۔

محمد ارشاد نے نہ صرف وطن سے کیا ہوا وعدہ وفا کیا بلکہ اپنے والدین کا سر بھی فخر سے بلند کردیا۔ان کے والد کہتے ہیں کہ میرے بیٹے کی قربانی نے ہمارے علاقے کے لوگوں کا سر بھی بلند کردیا ہے اور آج دیر کوہستیاں کی ہر ماں اپنے بچے کو اپنے ملک کے دفاع کے لئے وقف کرنے کا عزم رکھتی ہے۔تعلیم کے میدان میں ہمیشہ امتیازی کارکردگی دکھانے والے محمد ارشاد نے نہ صرف زندگی کے ہر میدان میں نمایاں مقام حاصل کیا بلکہ رہتی دنیا تک ایسے مرتبے پر فائز ہوگئے کہ جس میں ان سے سبقت لے جانا ممکن ہی نہیں۔ان کی بے مثل شجاعت،فرض شناسی اور وطن کی خاطر جان قربان کرنے کے اعتراف میں انہیں (بعد از شہادت) ستارۂ بسالت سے نوازا گیا۔

*****

نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

جویریہ صدیق

.....•••.....

کیپٹن محمد مجاہد بشیر (شہید) اکثر اپنی زندگی میں ایک شعر پڑھا کرتے تھے:

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

یہی شعر ان کی قبر پر کندہ ہے۔

نام مجاہد اور دل میں شہادت کی خواہش لئے جب یہ شیر دل دشمن سے ٹکرایا تو دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ پاکستان کا یہ بہادر بیٹا 8 جولائی 1986 کو پیدا ہوا۔ شروع سے ہی پاکستان آرمی میں جانے کا شوق تھا۔ ابتدائی تعلیم اسلام آباد ماڈل کالج سے حاصل کی۔ بی کام مکمل کیا۔ سولہ مئی 2008 کو پی ایم اے جوائن کیا اور 119 لانگ کورس میں شمولیت اختیار کی۔ 160 آر سی جی ائیر ڈیفنس رجمنٹ میں کمیشن حاصل کیا۔ 2012 میں ایف سی ہیڈ کوارٹر خیبر پختون خوا میں پوسٹنگ ہوئی۔ باجوڑ میں فرائض منصبی سنبھالے اور اپنی شہادت تک وہیں ڈیوٹی انجام دیتے رہے۔ 12 جولائی 2014 کو اس مرد مجاہد نے جام شہادت نوش کیا۔

باجوڑ کے قریب کٹ کوٹ کے مقام پر پاک آرمی کے ہیڈ کوارٹرز سے کیپٹن مجاہد نے فضل CP (سرحدی چیک پوسٹ) پر جانا تھا۔ ماہ رمضان تھا۔ کیپٹن مجاہد روزے سے تھے، ہیڈ کوارٹر بریفنگ کے لئے آئے۔ تاہم وہاں کام کی نوعیت کی وجہ سے دیر ہوگئی۔ روزہ کھولنے کے بعد نماز

سے فارغ ہوکر جب انہوں نے واپس فضل سی پی جانے کا ارادہ کیا تو سب نے منع کیا کہ اس وقت سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔لیکن پاک وطن کے اس مجاہد نے کہا،" چیک پوسٹ پر میرے ساتھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے، میں انہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

کیپٹن مجاہد رات گئے اپنے دیگر دو ساتھیوں کے ہمراہ روانہ ہوگئے۔انہیں پوسٹ پر پہنچنے کی جلدی تھی کیونکہ اس پوسٹ پر اکثر دشمن کی طرف سے حملے ہوتے رہتے تھے۔کیپٹن مجاہد خود واپس جا کر جلد سے جلد کمان سنبھالنا چاہتے تھے۔لیکن راستے میں ہی دہشت گردوں نے ان پر دو اطراف سے حملہ کر دیا۔کیپٹن مجاہد اور ان کے ساتھی مردانہ وار لڑے۔ہر طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ ہوگئی لیکن کیپٹن مجاہد نے جوانمردی سے مقابلہ کیا اور دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کیا۔تاہم وہ اس معرکے میں شدید زخمی ہوئے اور جب تک کٹ کوٹ سے پاک فوج کی مزید نفری آتی، کیپٹن مجاہد بشیر اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہادت پا چکے تھے۔

ان کے ساتھی ان کے یونٹ ممبران ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ بہت ہی خوش اخلاق اور نرم مزاج تھے۔ہمیشہ سب کے ساتھ بہت پیار اور شفقت سے پیش آتے۔وہ اپنی یونٹ کے تمام افراد سے رابطے میں رہتے۔ان کے دوستوں کے مطابق شہادت کی خواہش ان کے دل میں بہت شدید تھی۔بہادری سے لڑے اور بہادری سے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

گیارہ جنوری 2014 کو کیپٹن مجاہد صالحہ حیدر کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ 2012 میں نکاح ہوگیا تھا لیکن رخصتی 2014 میں مقرر ہوئی۔شادی کے بعد کچھ عرصہ چھٹی گزار کر کیپٹن مجاہد واپس محاذِ جنگ پر چلے گئے۔ان کی اہلیہ صالحہ کچھ عرصہ باجوڑ ان کے پاس رہ کر آئیں۔کیپٹن مجاہد کی بیٹی صبغہ اپنے والد کی شہادت کے سات ماہ بعد فروری میں پیدا ہوئی۔صالحہ مجاہد، بیوہ شہید کیپٹن مجاہد، اے پی ایس میں پڑھاتی ہیں۔وہ کہتی ہیں،" مجاہد سے شادی ہوئی تو مجھے لگا جیسے مجھ سے زیادہ اس دنیا میں کوئی خوش نصیب نہیں ہوگا۔وہ بہت ہی نرم مزاج محبت کرنے والے انسان تھے۔میں شادی کے بعد اکثر سوچتی اور اپنے آپ پر رشک آتا

تھا کہ مجھے اتنا اچھا انسان جیون ساتھی کے طور پر ملا۔ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات میری زندگی کا کل سرمایہ ہیں۔'' صالحہ کہتی ہیں،'' کیپٹن مجاہد مذہب سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔ پانچ وقت کی نماز کا اہتمام باقاعدگی سے کرتے اور روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے۔'' وہ کہتی ہیں،''ان کی عادات واطوار نے مجھے ان کا مزید گرویدہ کر دیا۔ان کی شہادت سے قبل میں باجوڑ گئی اور ہم نے کچھ دن ساتھ گزارے۔اس کے بعد وہ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلے گئے۔''

وہ کہتی ہیں کہ اتنا پیار کرنے والا انسان جب چھوڑ کر چلا جائے تو زندگی بے مقصد محسوس ہوتی ہے۔شروع شروع میں تو میرے ضبط کے سارے بندٹوٹ جاتے اور مجھے بالکل قرار نہیں آتا تھا۔لیکن جب میں شہید ہونے والے دیگر فوجیوں کی بیواؤں سے ملی تو ان کا صبر دیکھ کر مجھے انتہائی حوصلہ ملا۔میں نے زندگی کو ایک بار پھر مجاہد کی یادوں کے ساتھ آگے بڑھایا۔

صبغہ فاطمہ جو کیپٹن مجاہد کی شہادت کے بعد پیدا ہوئی،اس نے اپنے والد کا لمس تو محسوس نہیں کیا لیکن اس کی والدہ اسے باقاعدگی سے اس کے شہید بابا کی قبر پر لے کر جاتی ہیں۔صبغہ اپنی ماما کے فون پر جب کیپٹن مجاہد کی تصاویر دیکھتی ہے تو بابا،بابا کہہ کر ان کو پکارتی ہے اور خوب شور مچاتی ہے مگر اس کے بابا اس کو جواب دینے کے لئے اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ابھی تو وہ اتنی کم سن ہے کہ اسے معلوم نہیں کہ اس کی زندگی کا سب سے خوبصورت رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چلا گیا ہے۔

مسز کیپٹن مجاہد بشیر کہتی ہیں کہ وہ اپنے شوہر کی یادوں کے سہارے زندگی گزار رہی ہیں اور صبغہ فاطمہ ان کی متاعِ کل ہے۔وہ کہتی ہیں کہ مجاہد کی شہادت نے انہیں بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا لیکن گھر والوں اور سسرال والوں کی محبت اور شفقت نے انہیں ہمت دی کہ وہ زندگی کو آگے لے کر چل سکیں۔میرے اور صبغہ کے لئے ان کا چلے جانا ناقابل تلافی نقصان ہے۔تاہم ہمیں ان کی قربانی پر فخر ہے، انہوں نے اپنی جان پاکستان کے لئے قربان کی۔

آ گے چل کر جب ننھی صبغہ زندگی میں قدم بڑھائے گی تو اس کا ہاتھ تھامنے کے لئے اس کے بابا موجود نہیں ہوں گے۔اس کے اردگرد تمام بچے جب اپنے ماما بابا کے ساتھ آ گے بڑھ رہے ہوں گے تو ایک پل کو وہ رک کر سوچے گی ضرور کہ میرے بابا میرے ساتھ کیوں نہیں ہیں۔سب کام میری ماما کو اکیلے کیوں کرنے پڑ رہے ہیں۔لیکن جیسے جیسے شعور بیدار ہوگا تو وہ اپنے عظیم والد کی عظیم قربانی پر فخر کرے گی۔ہم سب کا بھی فرض ہے کہ ہم اپنے شہداء اور ان کے لواحقین کی قربانیوں کو ہمیشہ یاد رکھیں۔اس ملک کی اساس کیپٹن مجاہد جیسے شیر جوانوں اور صالحہ مجاہد اور صبغہ فاطمہ جیسی عظیم بیٹیوں کی قربانیوں پر کھڑی ہے۔

صبغہ فاطمہ کے نقصان کا خلا کبھی بھی پر نہیں ہوسکتا لیکن تمام پاکستانیوں کو اس کے والد کی قربانی اور اس کی والدہ کے صبر و استقامت پر فخر ہے۔کیپٹن مجاہد اور ان جیسے دیگر پاک فوج کے شہداء کی قربانیوں کی بنیاد پر آج وطن عزیز میں امن قائم ہوا ہے۔اللہ تعالی ہمارے شہداء کے درجات بلند فرمائے۔آمین

*****

یہ خاکِ وطن ہے جاں اپنی

جویریہ صدیق

.....◆◆◆.....

دہشت گردی کے مکمل خاتمے کے لئے پاک فوج نے آپریشن ضرب عضب کا آغاز کیا۔ اس آپریشن کی بدولت ان علاقوں میں پاکستانی حکومتی رٹ قائم ہوئی جہاں دہشت گرد قابض ہو چکے تھے۔آپریشن ضرب عضب کے دوران پاک فوج کے شیر دل جوانوں نے جرأت اور بہادری کی وہ مثالیں قائم کیں کہ جن کی اس سے پہلے نظیر نہیں ملتی۔کیپٹن عمیر عبداللہ عباسی شہید پاکستان کا شیر دل فرزند بھی اپنے دل میں شہادت کی خواہش لے کر وادی شوال میں دہشت گردوں سے ٹکرایا۔بس ایک عزم تھا کہ اپنے ملک کا چپہ چپہ دہشت گردی کے ناسور سے پاک کرنا ہے۔حوصلہ اس قدر بلند کہ شہادت سے پہلے ایک ویڈیو میسج ریکارڈ کروایا کہ قوم فکر نہ کرے، ہم دہشت گردوں سے اپنے تمام علاقے واپس حاصل کریں گے۔اپنی زبان کا پکا یہ مردمجاہد زیرو لائن پر اپنی جان اس ملک پر نچھاور کر گیا لیکن جاتے جاتے ملک کو شوال وادی واپس سونپ گیا۔ جواں سال بیٹے کی شہادت پر ماں باپ کا صبر اور فخر قابل دید تھا۔لیفٹیننٹ کرنل (ر) زاہد محمود عباسی نے کہا کہ انہیں اپنے شہید بیٹے کیپٹن عمیر عباسی کی بہادری پر فخر ہے اور ہمارے حوصلے بلند ہیں۔اگر آج میرا ملک میرا دوسرا بیٹا کیپٹن عمیص بھی مانگے تو وہ بھی اس وطن کے لئے حاضر ہے۔ ملک کے اس بہادر بیٹے کو جب لحد میں اتارا گیا تو آخری دیدار کے لئے ہزاروں افراد امنڈ آئے۔ہر لب پر شہید کی بہادری کے چرچے تھے۔پرسکون مسکراتے نورانی چہرے کے ساتھ، بڑی شان سے کیپٹن عمیر عباسی اپنے آخری سفر پر روانہ ہوئے۔

پاکستان کا یہ عظیم بیٹا 9 ستمبر 1988 میں منگلا میں پیدا ہوا۔تین بہن بھائیوں میں عمیر سب سے بڑے تھے۔والد لیفٹیننٹ کرنل (ر) زاہد محمود عباسی بھی چونکہ آرمی میں تھے،تو شوق انہی کو دیکھ کر ہوا کہ آرمی جوائن کر کے ارض پاک کی حفاظت کرنی ہے۔بچپن سے ہی ہر وہ چیز پسند تھی جو آرمی سے منسوب تھی۔ابتدائی تعلیم کراچی، ملتان، اوکاڑہ سے حاصل کی۔میٹرک اور ایف ایس سی فضائیہ ڈگری کالج کامرہ سے کیا۔عمیر عباسی ہونہار طالب علم تھے اور اپنی منزل کا تعین بہت پہلے کر چکے تھے کہ پاک فوج میں جانا ہے۔ایف ایس سی کے بعد فوج میں شمولیت کے لئے درخواست دی۔سلیکشن کے مختلف مراحل سے گزر کر اپریل دو ہزار آٹھ میں 121 لانگ کورس جوائن کیا۔دو سال کی ٹریننگ مکمل کی۔2010 میں پاس آؤٹ ہوئے۔ 14 ایف ایف رجمنٹ کو جوائن کیا اور 2010 میں پنوں عاقل میں پوسٹنگ ہوگئی۔اس دوران سیکنڈ لیفٹیننٹ کے طور پر انہوں نے سیلاب زدگان کے لئے امدادی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔اس کے بعد گوجرانوالہ میں پوسٹنگ ہوئی۔کوئٹہ میں ینگ آفیسرز کورس الفا گریڈز کے ساتھ پاس کیا۔اس کے بعد کیپٹن عمیر عباسی کی پوسٹنگ 49 ایف ایف کے ساتھ میران شاہ ہوگئی۔پھر دتہ خیل میں چھ ماہ کے لئے تعینات رہے اور اس علاقے کو دہشت گردوں سے پاک کروایا گیا۔چھ ماہ کے بعد کیپٹن عمیر اپنی یونٹ کے ساتھ امن مشن پر لائبیریا چلے گئے اور ڈیڑھ سال وہاں رہے۔

وطن واپسی کے بعد کیپٹن عمیر عباسی کی یونٹ کو شوال میں تعینات کر دیا گیا۔کیپٹن عمیر کی یونٹ نے دہشت گردوں کی آخری آماجگاہ کو ختم کرنا تھا۔ضرب عضب کے آغاز پر بہت سے دہشت گرد اس علاقے میں آ کر چھپ گئے تھے۔تین مہینے کیپٹن عمیر شوال میں رہے اور دہشت گردوں پر کاری ضرب لگائی۔شوال کا آپریشن بہت مشکل تھا۔کیپٹن عمیر نے خود اپنی یونٹ کے ساتھ اور سینئر آفیسرز کی رہنمائی میں کے جی ناپ آپریشن کی پلاننگ مکمل کی۔خود ایک مشکل اپروچ لیتے ہوئے انہوں نے پیش قدمی کی۔ڈیلٹا کمپنی کی کمانڈ کرتے ہوئے کیپٹن عمیر نے پندرہ کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کیا۔آگے دہشت گرد موجود تھے جنہوں نے فائر کھول دیا۔لیکن کیپٹن

عمیر آگے بڑھتے رہے۔

اسی لڑائی میں ڈھائی تین سو دہشت گردوں نے ایک ساتھ جوابی حملہ کیا۔ پہلی گولی کیپٹن عمیر کو بازو میں لگی لیکن وہ آدھا گھنٹہ زخمی بازو کے ساتھ لڑتے رہے۔ اس کے بعد دوسری گولی انہیں سینے پر لگی۔ وائرلیس سیٹ پر انہوں نے اپنے سی او کو کہا کہ میں اب جا رہا ہوں میری کمپنی آپ کے حوالے، میری طرف سے اللہ حافظ، پھر دوبار کلمہ طیبہ پڑھا۔ زیرو لائن پاک افغان باڈر پر 27 فروری 2015 کو کیپٹن عمیر عبداللہ عباسی نے جام شہادت نوش کیا۔

شہید کیپٹن عمیر عباسی نے اپنی ڈائری میں پہلے ہی اپنی شہادت کا تذکرہ کر دیا تھا۔ وہ شہادت کی آرزو لئے ہی شوال گئے تھے۔ انہوں نے ڈائری میں یہ خود رقم کیا کہ میرے پاس وقت کم ہے، میں شہید ہو جاں گا۔ اللہ تعالی مجھے بہت نوازیں گے۔ اس ڈائری میں انہوں نے اپنے خاندان کے لئے بھی پیغامات چھوڑے۔ شہید کیپٹن عمیر عباسی کے والد لیفٹیننٹ کرنل (ر) زاہد عباسی کہتے ہیں: ''ہمیں عمیر کی شہادت پر فخر ہے، ہم چاہتے ہیں ہمارا چھوٹا بیٹا کیپٹن عمیص بھی ضرب عضب میں حصہ لے کر دہشت گردی کا خاتمہ کرنے میں اپنا کردار ادا کرے۔'' وہ کہتے ہیں کہ فروری کو عمیر نے اپنی ڈائری میں لکھا، اللہ پاک مجھے شہادت کے رتبے پر فائز کریں گے، میری دعا ہے کہ میرے ماں باپ کا پیار اللہ اور اس وطن کے پیار پر غالب نہ آجائے۔ کرنل زاہد عباسی کہتے ہیں کہ اس نے ڈائری میں ہمارے لئے پیغام چھوڑا کہ میرے جانے کا غم نہیں منانا۔ مجھے اللہ تعالی نے ہی آپ کو نوازا تھا، اس نے ہی مجھے آپ سے واپس لے لیا۔ انہوں نے کچھ سامان شہادت سے پہلے اپنے ساتھی کو دیا اور کہا کہ یہ تم نے میری والدہ کو میری شہادت کے بعد دینا ہے۔ اپنے ایک ساتھی لیفٹیننٹ سلمان کو دوران آپریشن اپنی ساری کھجوریں دے دیں۔ انہوں نے کہا، ''سر! اپنے لئے تو کچھ رکھ لیں'' تو کیپٹن عمیر نے کہا، ''میرے لئے آگے بہت میوے ہیں۔''

شہید کے بھائی کیپٹن عمیص کہتے ہیں کہ میران شاہ میں عمیر کی یونٹ نے بہت سخت مقابلے

کے بعد علاقے کا کنٹرول سنبھالا۔ وہ کہتے ہیں، ''دو بار عمیر گولیوں کی بوچھاڑ کی زد میں آیا لیکن اللہ نے اس وقت شہادت نہیں لکھی تھی تو وہ گولیوں سے بالکل محفوظ رہا۔ شوال میں بھی اس نے کے جی ٹاپ آپریشن کو فرنٹ سے لیڈ کیا، شہادت پائی اور وہ علاقہ اسی دن کلیئر ہوگیا''۔ وہ کہتے ہیں، ''ہمیں عمیر کی یونٹ نے بتایا کہ وہ شیر کی طرح لڑا، سینے پر گولیاں کھائیں، لیکن آخری سانس تک لڑتا رہا۔'' کیپٹن عمیص کہتے ہیں کہ خارجین کے خلاف لڑنا افضل جہاد ہے۔ انسان نے اس دنیا سے جانا تو ہے تو کیوں نا اپنی زندگی اور جان وطن کے نام وقف کی جائے۔ کیپٹن عمیر عباسی شہید کے خاندان کے افراد ان کی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عمیر بہت ہی خدا ترس اور فرمانبردار طبیعت کا مالک تھا۔ جب چھٹی پر گھر آتا تو سب سے زیادہ وقت اپنے والدین کے ساتھ گزارتا۔ ان کی والدہ مسز زاہد کہتی ہیں کہ عمیر کی بس گھر آ کر یہ ہی فرمائش ہوتی تھی کہ ماما، چاؤمن بنائیں، بس پھر ناشتہ ہو، دوپہر کا کھانا ہو یا رات کا کھانا وہ صرف نوڈلز ہی کھاتا۔ ہمیں اکثر لانگ ڈرائیو پر لے جاتا۔ اس کو پہاڑی علاقے اور بارش بہت پسند تھی۔

مسز زاہد کہتی ہیں، ''عمیر مجھ سے اور اپنے والد سے بہت قریب تھے۔ گھر آ کر بس ہمیں فوج میں اپنے واقعات سناتے۔ ہر چھوٹی چھوٹی بات ہم سے شیئر کرتے۔'' وہ کہتی ہیں کہ جب بھی وہ کسی محاذ پر جاتا میں صرف یہ سوچ کر دل کو تسلی دیتی کہ یہ نبی پاک ﷺ کی فوج کے سپاہی ہیں۔ میں قرآنی آیات کے ورد کرتی۔ اس کے فون میں آیات، دعائیں سیو کر دیتی تاکہ وہ میدان جنگ میں ورد کرتا رہے۔ اللہ پاک نے بہت بار اس کو محفوظ رکھا لیکن شوال میں اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے شہادت لکھ دی تھی، مجھے اس کی شہادت پر فخر ہے۔ وہ کہتی ہیں، ''ہمیں ان شہداء کی قربانیوں کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہئے۔ میری گزارش ہے کہ سب وطن سے بہت محبت کریں، اس کی ترقی کے لئے کام کریں۔ ہمارے بچے اس ملک پر نچھاور ہوگئے لیکن اس وقت دل دکھتا ہے جب لوگوں کو میں وطن کے ساتھ مخلص نہیں دیکھتی۔ ہمیں چاہئے کہ اس ملک کی ترقی سلامتی کے لئے دن رات کام کریں۔''

سلام ان والدین پر جن کے بیٹے اس پاک وطن پر قربان ہوگئے ۔سلام ان شہداء کے لواحقین پر جو اپنے پیاروں کے جانے کے بعد بھی صبر و ہمت کی مثال ہیں ۔سلام ہے پاک فوج کے شہداء اور غازیوں کے عزم و ہمت پر جن کی بدولت آج ہم پر امن پاکستان میں سانس لے رہے ہیں ۔کیپٹن عمیر عباسی شہید کی قربانی اور ان کے خاندان کے صبر کو قلمبند کرنے کے لئے الفاظ ناکافی ہیں ۔وہ اس بات پر نازاں ہیں کہ بیٹے نے سینے پر گولی کھائی، پیٹھ نہیں دکھائی ۔آخری سانس تک جذبہ ایمانی اور وطن کی محبت سے سرشار یہ جوان وطن دشمنوں کے خلاف لڑتا رہا۔جہاں ایسا جذبہ ہو وہاں پر کیسا بھی دشمن ہو، ہمیشہ شکست سے دوچار ہوگا۔

*****

پھر تیرا رختِ سفر یاد آیا

شوکت نثار سلیمی

......♦♦♦......

مجھے کیا خبر تھی کہ اس کے سہرے کے لئے چنے پھول اس کی تربت پر ڈالنے ہوں گے۔میرے شہید میں بہت دور تک درد کے پاتال میں اتر گیا ہوں۔

یہ ستائیس اکتوبر 2015 کی ایک خنک رات تھی۔ جب میں نے اسے صبح چار بجے اسلام آباد ایئرپورٹ سے سیاچن کے سفر پر سکردو کے لئے الوداع کہا۔اس نے گرم جوشی سے مجھے پیار کیا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا ایئرپورٹ کے لاؤنج میں داخل ہوگیا۔الوداعی نظروں سے مسکراتے چہرے کے ساتھ مجھے دیکھا اور پھر ہمیشہ کے لئے اوجھل ہوگیا ہے۔میں بوجھل قدموں سے واپس لوٹ تو آیا لیکن آنکھیں اس کے رستے میں چھوڑ آیا۔ 12 دسمبر 2015 کی شام سٹیلائٹ فون پر مجھ سمیت اپنی ماں، بہن اور این سی بی (فوج کی طرف سے مہیا کردہ ملازم) سے آخری بات کی اور پھر یہ آواز سدا کے لئے بسیط فضاؤں کی وسعتوں میں تحلیل ہوگئی۔ 15 دسمبر کو ڈیڑھ بجے اس کی شہادت کی روح فرسا خبر ملی۔وہ ہمیں روتا بلکتا چھوڑ کر شہادت کے اعلیٰ ترین درجے پر سرفراز ہوکر اپنے رب سے جا ملا۔اس کی دیرینہ آرزو پوری ہوگئی۔اس کا یہ بے کنارہ جذبہ ابدی سچائیوں سے ہمکنار ہوگیا۔اپنے دوستوں سے کہا کرتا کہ وردی پہن کر شہادت کا نشہ دو آتشہ ہو جاتا ہے۔میں کند ذہن اور کور چشم اس کے اندر کی گہرائیوں کو نہ جان سکا۔شہادت سے پہلے خواب میں مجھے چند اشارے ضرور ملتے رہے مگر ذہن کے قرطاس پر یہ شکل واضح نہ تھی۔ کچھ

روز پہلے گیٹ کے باہر گھر کی گھنٹی بجی۔ باہر نکلا تو دور تک کسی انسان کا شائبہ تک نہ تھا۔ بیلیں اور خشک پھولوں کے سوگوار پتے اپنے سر جھکائے ہوا میں جھول رہے تھے۔ یہ منظر آناً فاناً بدل رہا تھا۔ میں کسی ناگہانی آفت کی گتھیاں نہ سلجھا سکا۔ آج یہ دھندلا منظر بالکل واضح ہو چکا تھا۔

5 جون 1989 کو ہماری گود میں آنکھ کھولنے والا، وہ سایہ سا ایک شخص میرے آنگن کا گھنا درخت تھا۔ سکول و کالج کے زمانے میں ہمیشہ ناپ پوزیشن پر رہا۔ بہت کم عمری میں غالب و اقبال، نسیم حجازی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، فیض و فراز، مولانا رومی، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، شیکسپیئر، ٹالسٹائی، میکسم گورکی اور سینکڑوں ادیبوں کو ازبر کر لیا۔ 2007 میں نہایت امتیازی حیثیت سے ایف ایس سی کرنے کے بعد آرمی میڈیکل کالج میں ایم بی بی ایس کے بتیسویں کورس میں داخلہ لیا۔ پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ چند ہی جست میں کئی منزلیں طے کر گیا۔

کالج کی قاسم کمپنی کا مکین تھا۔ پانچ سال کے عرصے میں نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں آگے آگے رہا۔ 21 اپریل 2013 کو ملٹری اکیڈیمی کاکول سے پاس آؤٹ ہونے کے بعد میڈیکل کور میں بطور کیپٹن باضابطہ کمیشن حاصل کیا۔ ایک سال کے لئے پہلی پوسٹنگ سی ایم ایچ پشاور میں ہوئی۔ ڈیڑھ سال پدھاڑ آزاد کشمیر میں گزارا۔ اگلے مرحلے کی پوسٹنگ اور زندگی کے آخری سفر کے لئے سیاچن کی بلند ترین چوٹی کا انتخاب ہوا۔ سیاچن میں بالتورو دنیا کا بلند ترین جنگی میدان شمار ہوتا ہے۔ راستے انتہائی کٹھن اور درجہ حرارت منفی پچاس ڈگری سینٹی گریڈ۔ وہاں افواج پاکستان کے سرفروش مادر وطن کی حفاظت کے لئے سر بکف رہتے ہیں تاکہ دشمن کو وطن عزیز پر میلی نظر ڈالنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ وہاں جانے سے پہلے ہی دوستوں سے شہادت کی آرزو کیا کرتا اور کہا کرتا، ''بزدل ہر روز کئی بار مرتے ہیں، بہادر صرف ایک بار مرتا ہے'' اور امر ہو جاتا ہے اور وہ امر ہو گیا۔ جارج برنارڈ شا کے ایک ناول کے کردار کا حوالہ دیتے ہیں کہا کرتا تھا:

''There is always danger for those who are afraid of it.''

مجھ سے کہنے لگا، ''پاپا جانی! سیاچن انتہائی دلکش علاقہ ہے۔ اسے پوری طرح دریافت ہی نہیں

کیا گیا۔'' وہ اس علاقے کو دریافت کرنے نکلا اور پھر وہیں کھو گیا۔ کہا کرتا تھا،'' یہ دنیا بہت چھوٹی ہے۔ میں کسی وسیع دنیا کا باشندہ ہوں۔'' پھر تم وسیع دنیا میں ہی چلے گئے۔ چھبیس سال کی عمر میں عالم شباب سے بھرپور یہ میرا اکلوتا بیٹا کیپٹن اسامہ بن نثار تھا۔ جواب کیپٹن ڈاکٹر اسامہ شہید ہے۔

بہت چھوٹی سی عمر میں محض دوسری جماعت کے طالب علم کی حیثیت سے چودہ اگست کے موقع پر سیکڑوں کے مجمعے میں وطن کی محبت کا نغمہ الاپتے ہوئے کہا تھا۔

'If you want to live with honour and dignity, love the motherland and be ready for every kind of sacrifice'

کالج میں داخلے کے وقت انٹرویو میں کہا:

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

انٹرویو کرنے والے افسروں نے کہا، اسامہ کوئی اور شعر سناؤ تو کہا:

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا
خوں آتا ہے جب نہیں آتا

شہید بیٹے، تم نے بالکل صحیح کہا تھا۔ یہ شعر مجھ پر صادق آتا ہے۔ میری چشم خوں بستہ اشک نہیں لہو اگلتی ہے۔ خون روتی خراب آنکھیں مجھ سے پوچھتی ہیں کہ وہ راہ حق کا مسافر تجھے تنہا چھوڑ کر کہاں گیا۔ یہ وادیاں تو گلوں کا مسکن ہیں اور محبتوں کے لطیف چشمے مسرتوں سے بھرے ہوئے ہیں مگر تمہارے لئے نہیں۔ تم ان سے محروم ہو۔ اب تنہا بیٹھ کر اشکوں کے ساتھ صبح کو شام کیا کرنا کیوں کہ تمہارا شام تم سے رخصت ہو چکا۔ اب اس کا سہرا لکھنے کا انتظار نہ کرنا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ اس کے سہرے کے لئے چنے پھول اس کی تربت پر ڈالنے ہوں گے۔ میرے شہید! میں بہت دور تک درد کے پاتال میں اتر گیا ہوں۔ تمہیں رخصت کرتے وقت میں نے تم سے کہا تھا،'' بیٹا جی! مجھے اپنی خیریت کی خبر دیتے رہنا۔'' آپ نے کہا،'' پاپا جانی No news is good news

''بیٹا تم نے ٹھیک ہی کہا تھا، جب تک تمہارے متعلق کوئی خبر نہیں آئی تھی تو خیریت تھی۔ جب خبر آئی تو شہادت کی۔تم نے وردی میں میرے سامنے آنے سے ہمیشہ گریز کیا۔صرف ایک بار باوردی دیکھا، بہت سجیلے اور بھرپور بانکپن میں دکھائی دیئے۔جیسے ہی میری دزدیدہ نگاہی کا علم ہوا فوراً سادہ کپڑوں میں ملبوس ہوآئے۔گھر میں رکھنے کے لئے وردی میں کوئی تصویر بھی نہ چھوڑی، شاید تمہارے وجدان میں شہادت کے چراغ بہت پہلے ہی ضوفشاں ہو چکے تھے۔تم نے اس کی حرمت پر آنچ نہیں آنے دی۔

تمہارے متعلق لکھنے بیٹھا ہوں تو دیوار جاں ٹوٹ رہی ہے۔شہید بیٹے! میں نے انگلیوں کو خون جگر میں ڈبو لیا ہے۔شب کے سناٹے کا عفریت میرے جسم کو نوچتا ہے۔رات سیاہ قبا پہنے تمہاری فرقت کے نغمے چھیڑتی ہے اور میرے رگ و جاں میں نیزے اتار دیتی ہے۔الفاظ چوکڑیاں بھرنا بھول گئے ہیں۔ہونٹوں پر پپڑیاں، زباں لب بستہ اور قلم شکستہ تمہارے فراق میں وقت کا پچھلی رات کے کسی لمحے درد و سوز کی لے پر المیہ گیت چھیڑتا ہے۔تو شب کے سناٹے میں میری گھائل روح کو چھیدتا چلا جاتا ہے۔اشکوں کا بے تاب سیل رواں خود ہی بہہ نکلتا ہے اور ضبط کے بند آپ ہی آپ ٹوٹ جاتے ہیں۔خداوند عالم بزرگ و برتر، میرے آنسوؤں پہ میری گرفت نہ کرنا۔ان پر میرا کچھ اختیار نہیں۔

تمہاری ماں بظاہر بہادر نظر آتی ہے مگر اندر سے ریزہ ریزہ۔چار سال بعد امریکہ سے لوٹ کر ملنے آنے والی تمہاری بڑی بہن رافعہ ہارون گنگ زبان کے ساتھ سوالیہ نظروں سے مجھ سے پوچھتی ہے۔میرا بھائی کہاں ہے۔بھانجا فائق احمد ضیا اور ننھی عدن ضیا ڈبڈباتی آنکھوں سے گھر کے سونے ماحول کو دیکھ رہے ہیں۔تمہارے ساتھ ہر وقت رابطے میں رہنے والی اٹھکیلیاں کرنے والی چھوٹی بہن ڈاکٹر شافعہ نثار ہمیں تسلیاں دیتی ہے۔خود رات کی تنہائیوں میں اشک بار رہتی ہے۔ڈاکٹر روحمہ جس سے تمہاری نسبت طے ہو چکی تھی، حیرت سے تکتی ہے۔میرا ہونے والا ہم سفر کہاں گیا۔تمہارے انکلز اور کزنز غم کی تصویر بنے نظر آتے ہیں۔تمہارے دوستوں اور رفقائے

کارکوتمہارے تذکروں سے فرصت نہیں، میں کسی کو کیا جواب دوں۔ میں تو خود حیرت کدے میں بت بنا کھڑا ہوں۔تمہاری یادوں کے جلترنگ بجتے ہیں تو امیدوں کے معبدوں اور آنکھوں کے طاقچوں میں رکھے چراغ ایک ایک کر کے بجھتے چلے جاتے ہیں۔لوگ مجھ گنہ گار سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں کہ میں شہید کا باپ ہوں۔مگر میں کس قدر بکھر گیا ہوں، کوئی اس کا اندازہ نہیں کر سکتا۔دنیا میں تم ہی میرے دوست اور یار طرح دار تھے۔تمہارا ہاتھ میری زندگی کی نبض پر تھا۔ وقت کی دہلیز پر یہ نبض اب ڈوب رہی ہے۔

تم تو جذبہ کیف میں ڈوبے ہوئے تھے، سیاچن میں قیام کے دوران دو بار تمہاری طبیعت خراب ہوئی۔ہمیں خبر تک نہ ہونے دی۔تم 123 میڈیکل بٹالین کا حصہ تھے۔ڈاکٹر ہونے کے ناتے ہیلی کاپٹر تمہاری صوابدید پر تھا۔اپنے ساتھی کیپٹن کو بیمار ہونے پر بذریعہ ہیلی کاپٹر علاج کی غرض سے نیچے والی پوسٹ پر بھیج دیا اور خود ہیلی کاپٹر کا سہارا لینے سے انکار کر دیا۔تمہارا اصرار تھا کہ میں پیچھے ہٹنے کے بجائے ہر صورت اگلی پوسٹ پر پہنچوں گا۔پاک فوج نے مجھے مسیحا بنا کر اپنے ساتھیوں کی دیکھ بھال اور علاج معالجے کے لئے مقرر کیا ہے۔میں اپنے سینے پر بزدلی کا داغ نہیں سجا سکتا اور نہ ہی میری خودداری اس کی اجازت دیتی ہے۔تمہارے سینئر اور جونیئر افسران نے روکا بھی کہ اسامہ آخری پوائنٹ تک جانے سے پہلے کچھ آرام کر لو لیکن تم بضد رہے کہ میں ساتھیوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔میں ان کے ساتھ ہی اگلی پوسٹ پر پہنچوں گا۔تمہارا ایک ہی عزم تھا کہ ہر حال میں دنیا کی بلند ترین جنگی چوٹی پر پہنچ کر سورج کی پہلی کرن وہاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اللہ نے مجھ سے کوئی بڑا کام لینا ہے۔تم نے واقعی سورج کی روپہلی کرنوں کو وہاں روشنی بکھیرتے دیکھا۔تم تیموری پوسٹ کراس کر کے تقریباً 20 ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ چکے تھے کہ ہائی آلٹیچیوڈ ایفیکٹ کی بدولت تمہارے دماغ اور پھیپھڑوں میں سوجن ہوگئی۔ایسے میں ریکوری کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں اور ریسکیو ٹیم کے پہنچنے سے پہلے تم بہشت آفریں نظاروں سے ہم کنار ہو گئے۔ تم نے کہا تھا کہ میری شہادت قریب ہے۔ہیلی کاپٹر تیار رکھنا اور مجھے میری ماں کے پاس پہنچا

دینا۔ پھر تمہارا تابوت پاکستان کے پرچم میں لپٹ کر تمہاری ماں کے پاس پہنچ گیا۔

شہید بیٹے تم! نے وطن عزیز کی سربلندی کے لئے اپنی جان نثار کردی اور دشمن کو یہ پیغام دے گئے کہ وطن کی سرحدوں پر مامور ہر جوان اسامہ بن کر پہرا دے رہا ہے۔ کسی کو کیا خبر کہ پاک افواج کے جوان اور افسر چٹیل میدانوں، صحراؤں، ریگستانوں، تند خو دریاؤں، بپھری ہوئی فضاؤں اور فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں پر جوانی کے مزے نہیں لیتے، وہ تو جان ہتھیلی پر رکھ کر قوم کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس دکھ کو وہ مائیں جانتی ہیں جن کے جگر گوشے ان سے جدا ہو گئے۔ وطن عزیز کے یہ رکھوالے اپنے والدین، بہن بھائیوں اور اپنی سہاگنوں پر بھی نہیں کھلتے کہ خاموشی ہی ان کے منصب کا تقاضا ہے۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

پاکستان آرمی کی انتہائی اعلیٰ قیادت نے میرے نام اپنے خطوط میں، جن میں تعزیت بھی ہے اور پیغام تہنیت بھی، تمہیں بہت زریں الفاظ میں خراج پیش کیا۔ چیف آف آرمی سٹاف جنرل راحیل شریف نے لکھا ہے کہ شہید نے فرض کی ادائیگی میں جس ایثار لگن اور انتھک محنت کے مظاہرہ کیا، وہ پاک فوج اور میرے لئے انتہائی فخر اور سعادت کا باعث ہے۔ میں شہید کی فرض شناسی کی قدر کرتا ہوں۔

بلاشبہ یونٹ اور پاکستان آرمی کے تمام افراد اپنے شہداء کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں۔ شہید اپنی اعلیٰ اور بے مثال کارکردگی اور دلیرانہ شجاعت کی بدولت یونٹ میں اپنے بالا کمانڈ راور ساتھیوں میں نہایت ہی مقبول تھے۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایک شہید کا باپ ہوں۔ میرے بیٹے نے اپنے وطن کے لئے جان نثار کی۔ لیکن اس کی کمی تو ظاہر ہے زندگی بھر محسوس ہوتی رہے گی۔ اللہ ہمیں صبر دے اور اس پاک سرزمین کو ہمیشہ سلامت رکھے۔

*****

حق کا مال تھا، حق ادا کر گیا

حمیرا شہباز

.....•••.....

12 پنجاب کے شہداء کی فہرست میرے ہاتھ میں تھی۔ان سب سے نسبت کا ایک مشترکہ پہلو تو تھا ہی لیکن جب اس فہرست پر تفصیلی نظر دوڑائی تو نگاہِ انتخاب برگزیدۂ الٰہی، شہید حق نواز کے نام کے آگے لکھے اس کے گھر کے پتے پر جا ٹھہری، ''تحصیل میاں چنوں!'' مجھے اپنی بے خبری پر افسوس ہوا کہ یہ شہید تو میرا گرائیں ہے۔میرا فخر ہے، دوسرے تمام شہیدوں کی طرح۔

ضلع خانیوال کے شہر میاں چنوں کی ایک نام نہاد تقسیم اس کی ریلوے لائن کی مناسبت سے ہے۔ریلوے اسٹیشن کے اِس طرف نسبتاً ترقی یافتہ علاقہ ہے۔اس پار کی دنیا کو ہم بچپن سے ''ٹیشن پار'' یا ''لینوں پار'' کہتے اور سنتے آئے تھے جس کو ہم اپنی دانست میں پسماندہ بھی تصور کرتے تھے۔شہید حق نواز کی معروفیت کی امید پر اس کے گھر کی کھوج نہایت روایتی طریقے سے لگائی گئی۔غوثیہ مسجد میں جب پوچھا گیا کہ کوئی شہید حق نواز کو جانتا ہے تو امام صاحب اسی کے چک کے نکلے اور وہ چک تھا ''ٹیشن پار'' کا۔ہماری کوتاہ نظری میں یکدم ٹیشن پار کا خطہ ہمدوشِ ثریا ہو گیا۔

گاڑی (ہماری کار، نہ کہ ریل گاڑی) ریلوے پھاٹک کو عبور کر کے لائنوں پار روہاڑی جانے والی رہگزر پر رواں تھی۔ چک 125/15، ایل کے سٹاپ نمبر 3 اور جنڈیالی 16 جیسے مقامات سے گزرتے، کہیں کھیت کھلیان اور اینٹوں کے بھٹے، تو کہیں راستے میں پڑتے چھوٹے چھوٹے

بازاروں سے گزر کر گاڑی آگے بڑھتی رہی۔سر راہ پڑتے بسم اللہ کتاب گھر، فاروق ٹینٹ سروس، جدہ ٹائل اسٹور، ڈوگر زرعی انڈسٹریز، غوث پاک فرنیچر جیسے تجارتی مراکز بازاروں کی رونق بڑھا رہے تھے۔مٹی کے برتنوں کی ریڑھیاں، دکانوں پہ پڑی چھابیاں، جھاڑو، سٹیل کے ڈول، بان کی گانٹھیں، تربوزوں کے ڈھیر میرے اندر کے خریدار کو اکسا رہے تھے۔لیکن چشم خریدار تو گوہر جاں بار دینے والے سوداگر کے سراغ میں سرگرداں تھی۔

چک 122/15 ایل، کی جانب مڑے تو گلیوں کی خاک اڑا کر ہماری گاڑی کا پیچھا کرنے لگی جس پر کبھی حق نواز کے قدموں کے نشان ٹھہرے ہوں گے۔''سجناں نال سجن''، ''محمد ﷺ کے غلاموں کا کفن میلا نہیں ہوتا''، ''عباسِ علمدار''، جیسے نوشتۂ دیوار بھی پڑھنے کو ملے۔میں منہ اٹھائے چک کے در و دیوار کی عظمت کا اندازہ لگا رہی تھی کہ ڈرائیور نے سڑک کنارے کھڑے چند افراد کے قریب پہنچ کر کار کو بریک لگا دی۔ان میں سب سے آگے ایک عمر رسیدہ خاتون تھی۔ابھی میں گاڑی سے اتری ہی تھی کہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئیں۔''سو بسم اللہ''، ''جی آیاں نوں'' جیسے کلمات ان کی زبان پر تھے۔ان کے چہرے پر جذبات کی شدت سے مجھے اس وقت اندازہ ہوا کہ ان کا انتظار تو میرے شوق دیدار سے کہیں بڑھ کر تھا۔مجھے معلوم تو تھا ہی کہ وہاں ہماری ملاقات شہید حق نواز کے افرادِ خانہ سے ہوگی۔لیکن کسی شہید کے اہلِ خانہ کے ایسے پرتپاک استقبال کا مجھے اندازہ نہ تھا۔

ہم ایک بڑے سے گیٹ والے گھر میں داخل ہو چکے تھے۔اماں جی نے گیٹ کے فوری بعد بنے ہوئے ایک تاریک کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ہمارے پیچھے اماں جی، دو آدمی، ایک اور خاتون اور پانچ چھ بچے بھی آ گئے۔کمرہ نیم تاریک تھا۔کچھ دیر میں نگاہ تاریکی کی عادی ہوئی تو میں نے اندازہ لگایا کہ یہ شہید حق نواز کا کمرہ ہے کیونکہ اس کمرے کی دیوار پر ایک فوجی کی بڑی سی تصویر آویزاں تھی جس پر سنہری تاروں والا چمکیلا ہار ڈلا ہوا تھا۔اس تصویر کے فریم کے اوپری دونوں کونوں میں سلطان باہو کے گدی نشینوں کی چھوٹی چھوٹی تصاویر ٹانکی گئی تھیں جو شہید کے

خاندان کے مکتب عقیدت کی نشان گر تھیں۔

ہم سب نے کئی بار ایک دوسرے کا حال پوچھا۔میاں چنوں کی گرمی کا گلہ کیااور کم کم آتی بجلی کی غیبت کی۔بال آخر میں نے اپنی کرسی کے بائیں طرف بچھے پلنگ پر بیٹھی اماں جی سے پوچھا:''ماں جی تسی حق نواز دی والدہ جے؟''ان کی آنکھوں کے دمکتے دیئے حق نواز نام کی ہوا سے بھڑک اٹھےاور کمرہ روشن ہوگیا۔میں نے کمرے میں موجود افراد کا تعارف چاہا۔وہ دو آدمی حق نواز کے بڑے بھائی تھے جو زیادہ دیر کمرے میں رکے نہیں۔میرے سیدھے ہاتھ والی کرسی پر بیٹھی ہوئی خاتون کی طرف دیکھ کر اماں جی نے کہا:''ہے حق نواردی بیوی ہاے(مجھے سن کر اچھا لگا کہ اماں جی نے اس کو حق نواز کی بیوہ نہیں کہا)یہ الگ بات ہے کہ اس کی طرف بغور دیکھنے کی میری ہمت نہیں تھی۔اس کے چہرے کی تحریر پڑھنے کے بجائے میں نے اماں جی سے یہ پوچھنا آسان جانا کہ ان کو حق نواز کی شہادت کا کیسے پتا چلا۔

انہوں نے کچھ اس طرح سے بتایا کہ سال 2004 کی ایک صبح پولیس کی گاڑی ہمارے گھر آئی۔انہوں نے حق نواز کے گھر کا پوچھا کہ یہی ہے اور کسی مرد سے بات کرنی چاہی۔گھر پہ میں اکیلی تھی اس لئے وہ چلے گئے۔کچھ دیر بعد پھر آئے،میرا رشتے کا بھائی ان سے ملا۔پولیس نے اس کو کچھ بتایا اور چلی گئی۔میں نے اپنے بھائی سے پوچھا کہ پولیس حق نواز کا کیوں پوچھ رہی تھی؟ کیا کیا ہے اس نے؟ کیا ہوا ہے اس کو؟میرے بھائی نے بڑے آرام سے کہا:''او کچھ نہیں کیا اس نے،ہونا کیا ہے،شہید ہوگیا ہے وہ اور کیا!۔''پولیس کی دور جاتی گاڑی ابھی تک میری نظر میں تھی۔میں اس کے پیچھے بھاگی،پھر تھک کر وہیں سڑک کنارے بیٹھ گئی۔پھر گھر کو دوڑی۔مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کیا کروں۔

اماں جی ابھی بھی ہاتھ مسل رہی تھیں جیسے اچانک کوئی ان کے ہاتھ سے متاع حیات لے اڑا ہو۔مجھ سے اتنا نہ ہوسکا کہ ان کے قریب جا بیٹھوں اور ان کے ہاتھ تھام کر کہہ سکوں کہ ماں جی آپ حوصلہ کریں۔اتنا حوصلہ کہاں تھا مجھ میں۔

انہوں نے اپنی بات جاری رکھی: ''بس پھر تھوڑی دیر میں کئی فوجی گاڑیاں آ گئیں۔ بڑے بڑے فوجی افسر آئے۔ میرے حق نواز کو بڑے اعزاز سے دفنا کر چلے گئے۔'' وہ مسکرا کر بولیں: ''حق کا مال تھا، حق ادا کر گیا۔''

نائیک حق نواز، اللہ دتہ اور اماں بخت بھری کے چھ بیٹوں اور ایک بیٹی میں سے تیسرے نمبر پر تھا۔ اس نے گورنمنٹ پرائمری اسکول ایل 122/15 سے ابتدائی اور گورنمنٹ ہائی اسکول ایل 124/15 سے مڈل اور میٹرک تک کی تعلیم حاصل کی۔ پاک فوج میں بھرتی ہوگیا۔ پنجاب رجمنٹل سینٹر مردان سے تربیت حاصل کی اور کوئٹہ، زیارت، چمن اور نوشہرہ میں پیشہ ورانہ خدمات انجام دیں۔ 2004 میں اس کی ماں نے اس کی شادی کر دی۔ نئی زندگی کا آغاز کرنے والے حق نواز کی اپنے گھر والوں اور شریکِ حیات سے یہ آخری ملاقات تھی۔ 18 مارچ سال 2004 میں 12 پنجاب آپریشن المیزان کے سلسلے میں وانا میں تعینات تھی۔ ''نائیک حق نواز، میجر ثاقب زمان کے زیرِ قیادت شین ورسک کے علاقے میں آپریشن کرنے والی اگلی سپاہ کا حصہ تھے۔ کمپنی کمانڈر کی شہادت کے بعد آپ نے اپنے جونیئرز کو بہترین طریقے سے منظم کیا اور بہادری سے دہشت گردوں کا مقابلہ کرتے کرتے جامِ شہادت نوش کیا۔''

*****

جانثاران وطن

ونگ کمانڈر (ریٹائرڈ) ڈاکٹر عاطف منصور ملک

.....◆◆◆.....

اگر آپ اکبری دروازے سے اندرون لاہور میں داخل ہوں تو تنگ بازار سے گزر کر محلہ سریاں والا آتا ہے۔ غازی علم دین شہید کا گھر اسی محلے میں تھا، انہی کے نام پر اب وہاں کا چوک موسوم ہے۔ اس چوک سے بائیں جانب مڑ کر کوچہ چابک سواراں سے گزرتے جایئے تو آگے محلہ ککے زئیاں آتا ہے۔ ککے زئی اسے عرف عام میں بڑی گلی کہتے ہیں۔ گو کہ یہ گلی اتنی تنگ ہے کہ کسی مرگ پر جنازہ بھی آسانی سے نہ نکل پائے۔ کہتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ حملہ آور لشکر میں یہ قبیلہ تھا۔ فاتح قوم کے طور پر انہوں نے مفتوح علاقے کو اپنا مسکن بنایا۔ صدیاں گزر گئیں مگر ککے زئی اپنے رنگ کے ساتھ جڑے رہے۔ ککے زئی ایک لڑاکا قوم ہے۔ اندرون لاہور میں محلہ ککے زئیاں کی لڑائیاں اور شادیاں دونوں ضرب المثل ہیں۔ یہ عجب رنگ کے لوگ ہیں، ایک طرف لڑنے کو تیار، دوسری جانب یار باش، مہمان نواز، کھل کر کھلانے والے۔ آپ سے محبت بھی کھل کر کریں گے اور لڑیں گے بھی کھل کر۔

وقاص شمیم ککے زئی تھا، ٹھیٹ ککے زئی۔ لڑنے مرنے کو تیار، کھل کر پیار کرنے والا۔ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ شرارت کی چمک تھی، اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک مسکراہٹ رہتی تھی ایسے کہ ابھی کوئی حرکت کرے گا، کوئی طوفان لائے گا۔ وہ ایک بے چین روح تھا، کبھی نہ بیٹھنے والا، جس کو کسی طور چین نہ آئے۔ آتے جاتے کوئی بات کرنے والا، ایک معرکے سے نکل کر اگلے معرکے کی

تلاش میں رہنے والا۔

اس کی آواز اس کی آنکھوں کی طرح اندر اترنے والی تھی۔ وہ عجب شخص تھا، اس کی آنکھیں، اس کا چہرہ، اس کا اندر باہر ایک تھا۔ ہمارا اس سے عجب تعلق تھا، کبھی اس کی حرکتوں سے ہم زچ ہو جاتے تھے، کبھی وہ ہمارا محبوب تھا۔ وہ ہماری زندگیوں میں غیر محسوس انداز میں داخل ہو گیا، اس کا ظاہری دکھاوا ایک لاپروا، لاابالی، سر پھرے کا تھا، مگر اس کی عجب خاصیت تھی۔ وہ آپ کے درد کو خود بخود محسوس کر لیتا تھا، بغیر بتائے جان لیتا تھا اور پھر وہ اپنی بساط سے بڑھ کر جو کچھ کر سکتا تھا، کرتا تھا۔ کورس میٹ، افسر، ایئر مین، بیٹ مین سب کے لئے اس کے دل کے دروازے کھلے تھے، اور کھلے بھی چار چو پٹ تھے، بلکہ وقاص کی شخصیت کے لحاظ سے تو اس نے دروازے کے کواڑ ہی اتار کر پھینک دیئے تھے کہ کسی کو آنے میں پریشانی نہ ہو۔

میں نے بچپن سے اپنے بزرگوں سے ککے زئیوں کی کئی باتیں سن تھیں، نعرہ تھا، ککے زئی، ہائے جان گئی۔ وقاص کو جب میں نے کہا، ''ککے زئی، میں نے سنا ہے کہ درانتی کے ایک طرف دندے ہوتے ہیں، مگر ککے زئی کے دوطرف دندے ہوتے ہیں۔'' تو وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا، '' ملک جانے دے۔''

مجھے نہیں علم کہ کب وقاص کے بزرگ اندرون لاہور سے نکلے اور بیگم روڈ پر آ کر رہنے لگے۔ بیگم روڈ مزنگ اڈہ سے شروع ہوتی ہے اور جین مندر پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے گھر میں داخل ہوں تو کھلا صحن تھا، جہاں ہر روز اس کی والدہ ہر شام نوکروں کے اور محلے کے بچوں کو پڑھاتی تھیں۔ اس کی والدہ ایف جی سکول میں تعلیم دیتی تھیں، جبکہ اس کے والد کرنل شمیم پی ایم اے کاکول میں شعبہ ریاضی کے سربراہ تھے۔ یہ اساتذہ کا گھر تھا۔ بے لوث، کھرے مخلص۔ وقاص خود کیڈٹ کالج حسن ابدال سے پڑھا تھا۔ مگر مجھے نہ جانے کیوں وقاص میں مزنگ اڈے کے تھڑے پر فارغ بیٹھے لوگوں کی بود باش اور جین مندر میں گائے گئے بھجنوں کا رنگ نظر آتا تھا۔ سرگودھا میں پوسٹنگ کے وقت اس نے ایک کنٹینر قابو کیا ہوا تھا اور اس میں اکیلا رہتا۔ اس کی

طبیعت کی سیمابی اس کی متحمل نہ تھی کہ وہ کسی اور کے ساتھ کمرے میں رہتا۔شام کو وہ اپنے بیٹ مین کے بچے کو پڑھاتا تھا۔وہ اپنے ماں باپ کے پیچھے چلتے اپنے حصے کی تعلیم کی شمع کو روشن کئے ہوئے تھا۔

وہ ایک بے چین روح تھا،ہر کام جلد کرنے والا،ہر دم تیزی میں رہنے والا،شاید اسے علم تھا کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔اکیڈمی میں چھٹیوں پر جانے کے لئے جب بک شدہ فلائنگ کوچیں آتی تھیں تو وقاص ہمیشہ اچک کر ڈرائیور کے ساتھ والی سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھتا تھا،اب کوئی جو مرضی کر لے وہ سیٹ کسی اور کو نہیں مل سکتی تھی۔یہ ہر دفعہ کا معاملہ تھا۔میں اسے کہتا تھا،''ککے زئی،اگلی سیٹ پر بیٹھ کر گیا تو کوچ سے پہلے لاہور پہنچ جائے گا۔''وہ ہنستا تھا اور کہتا تھا،''ملک،جانے دے۔''

وقاص خوددار تھا،بلا کا خوددار۔یہ صفت اس کے خون میں شامل تھی۔جب اس کا بڑا بھائی جنید شمیم پی ایم اے کاکول سے پاس آؤٹ ہو رہا تھا تو وقاص نے پریڈ پر جانے کے لئے چھٹی کی درخواست دی جو کہ نہ ملی۔جنید پی ایم اے کا سب سے بڑا اپاٹمنٹ ہولڈر تھا،پاسنگ آؤٹ پریڈ کمانڈ کر رہا تھا،پاسنگ آؤٹ پر اسے اعزاز مل رہا تھا۔وقاص کے والد پی ایم اے کے شعبہ ریاضی کے ہیڈ تھے۔اکیڈمی سے کیڈٹ سرکاری طور پر پریڈ دیکھنے پی ایم اے جا رہے تھے،مگر وقاص اس گریجویشن پریڈ پر نہیں گیا۔کرنل شمیم کی خودداری یہ اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ کسی کو ایک فون ہی کر لیتے۔

جب وقاص کی سرکاری جیپ سرگودھا کے کرانہ پہاڑ سے گری،وہ اپنے دو ساتھی افسروں کے ہمراہ بیس کے میڈیکل سکواڈرن سے سالانہ طبی معائنہ کروا کر پہاڑ کی چوٹی پر لگے ریڈار پر جا رہے تھے۔مجھے یقین ہے کہ جب موت کا فرشتہ اس کے سامنے آیا ہوگا تو وقاص نے آنکھوں میں شرارت کے ساتھ اس سے پوچھا ہوگا کہ بھائی،آپ لینے تو آ گئے ہیں مگر ریکارڈ چیک کر لیں کسی اور کی جگہ تو مجھے غلطی سے نہیں لے جا رہے۔اچھا اب آپ آ ہی گئے ہیں تو یونیفارم میں ڈیوٹی پر ہوں،پہاڑ کی اتنی بلندی سے گرا ہوں،شہادت کا رتبہ لکھنا نہ بھولئے گا۔صبح کا ناشتہ بھی نہیں کیا،

دیکھیں یہ اخبار میں لپٹا ساتھ ہے، روزہ دار کا درجہ بھی لکھ لیں۔

مغرب کے قریب میانی صاحب کے قبرستان میں وقاص کو دفنا کر میں اس کے گھر پہنچا۔ اس کے والد غم پر قابو پانے کی کوشش کرتے لوگوں کی تواضع کے بارے میں فکرمند تھے، اس کی والدہ اس کے کورس میٹوں کو لپٹا کر چوم رہی تھیں۔ میں چپ چاپ اپنے موٹر سائیکل کو سٹارٹ کئے بغیر گھسیٹتا جین مندر تک آ گیا، روح میں دور تک دکھاتر آیا تھا۔ آدھا فرلانگ چل کر موٹر سائیکل کو کک ماری اور اپنے گھر کو چل پڑا، آگے ڈیوس روڈ سے ٹھنڈی سڑک کو جا مڑا۔

ٹھنڈی سڑک ویسے بھی ایک فسوں رکھتی ہے، ایک جانب ایچی سن کالج اور زمان پارک دوسری جانب انگریز دور کے بنے ریلوے افسران کے بڑے بڑے بنگلے۔ درخت اتنے کہ سخت گرمی میں بھی اس سڑک پر داخل ہوں تو ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے، اسی وجہ سے لاہور کے باسی سندر داس روڈ کو عرفِ عام میں ٹھنڈی سڑک کہتے ہیں۔ طبیعت پر بوجھ اتنا تھا کہ موٹر سائیکل سڑک کے کنارے ایک طرف روک دی اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے، رومال اور دامن دونوں تر تھے۔ اچانک درختوں میں تیز ہوا چلنے لگی اور آواز آئی، ''ملک جانے دے۔''

ککے زئی، جانے دیا۔ پر کیا کروں برسوں گزر گئے مگر جانے نہیں دیا جاتا۔ تیری تصویریں البم سے نکال کر رکھ دی ہیں مگر تو بڑا سخت جان ہے، دل پر تیرا نقش ماہ و سال کی گرد کے باوجود روشن ہے۔ ابھی تو آئے گا، کسی نئی حرکت، کسی نئے چٹکلے کے ساتھ۔ خوش رہ، امید ہے کہ تو نے وہاں بھی خوب ادھم مچا رکھا ہوگا۔

*****

مجھے مار دیجیے

لیفٹیننٹ کرنل عارف محمود

.....•••.....

کیپٹن ریٹائرڈ سید احمد مبین شہید اور موت میں شناسائی بہت پہلے قائم ہو چکی تھی، بارہا قضا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دہشت گردوں سے مقابلہ کرنے والا یہ نڈر آفیسر 2013 میں کوئٹہ پولیس لائن میں جنازے کے دوران ہونے والے خودکش دھماکے میں معجزاتی طور پر بچا تھا۔ جنازے پہ جاتے ہوئے اچانک سید مبین کی ماں کی طبیعت خراب ہوگئی تھی اور وہ جنازہ چھوڑ کر اپنی ماں کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے واپس آ گئے تھے، اس دھماکے میں ان کے قریبی ساتھی ڈپٹی انسپکٹر جنرل فیاض احمد سنبل نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ انھیں اب موت کا کچھ خوف نہ تھا، ابھی دو ہفتے قبل انھوں نے اپنی سماجی رابطے کی سائیٹ فیس بک پر ایک نظم میں دشمنانِ امن و انصاف کو یہ دعوتِ عام دی تھی کہ وہ تو حق کی راہ سے ہٹنے والے نہیں، جو لوگ محض اس جرم پر ان کی جان کے درپے ہیں وہ بے شک اپنا وار آزما ڈالیں۔

زندہ رہا تو کرتا رہوں گا، ہمیشہ پیار!

میں صاف کہہ رہا ہوں، مجھے مار دیجیے

(شہید کی فیس بک ۔ 23 جنوری 2017)

اس دن بھی وہ پیار کا علم لئے لاہور کی مال روڈ کو عوام کے لئے کھلوانے چلے تھے، ''میں خود جا کر لوگوں سے بات کرتا ہوں کہ'' وہ مال روڈ کو عوام کے لئے کھول دیں۔'' یہ تھے وہ الفاظ جو انھوں نے مقتل میں جانے سے پیشتر ادا کئے تھے۔ لوگوں سے بات چیت کے دوران انھیں اپنے

ایک خیر خواہ ڈی آئی جی نے فون پر بہت اصرار کیا تھا کہ وہ مظاہرے کی جگہ سے چلے جائیں، کیونکہ انہیں واضح الفاظ میں دہشت گردوں کی طرف سے حملے کی دھمکیاں بھی موصول ہو چکی تھیں لیکن ان کے قریبی ساتھی بتاتے ہیں کہ وہ موت کی دھمکیوں کی ذرا بھی پروانہ کرتے تھے بلکہ ہر حساس اور اہم آپریشن کی قیادت رضا کارانہ طور پر خود کرتے، جعلی ادویہ سے متعلق احتجاجی مظاہرے میں بھی وہ از خود لوگوں کو منتشر کرنے چلے آئے تھے، جبکہ یہ ان کی ذمہ داری بھی نہ تھی۔ سید احمد مبین کی والدہ بتاتی ہیں کہ شہادت کے دن میرا بیٹا صبح گھر سے روانہ ہوتے ہوئے کہنے لگا: ''امی آج مجھے تھکاوٹ ہو رہی ہے، بس یہ کام نمٹا کر آتا ہوں پھر آرام کروں گا۔'' میں نے کہا: ''بیٹا! اگر تھکے ہو تو مت جاؤ، تمہارا جانا ضروری تو نہیں۔'' کہنے لگا، ''بس یہ کام کر کے آرام کروں گا۔'' مجھے کیا خبر تھی کہ وہ ابدی آرام کی بات کر رہا تھا۔

دہشت گرد شکاری کتوں کی طرح سید احمد مبین کی تاک میں رہتے تھے، اس دن بھی چار دہشت گردوں نے فیصل چوک مال روڈ لاہور کا رخ کیا تو ان کا ہدف دیگر معصوم جانوں کے علاوہ سید مبین خصوصی طور پر تھے، احتجاج کے مظاہرین کی حفاظت پر مامور ایس ایچ او عابد بیگ نے بعد میں انکشاف کیا کہ اس نے جب مشکوک افراد کو مقامِ احتجاج کی طرف بڑھتے دیکھا تو رکنے کا اشارہ کیا، جس پر ایک مشکوک شخص خاردار تاریں پھلانگ کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا اور مظاہرین میں شامل ہو گیا جبکہ تین بھاگ گئے۔ یہی 22 سالہ نوجوان دراصل خودکش بمبار تھا جو مظاہرین کے جھرمٹ میں گھرے ہوئے سید احمد مبین کے بالکل قریب جا پہنچا تھا۔ وہ اپنی فطری بردباری اور انسان دوستی کے ہاتھوں مجبور مسلسل لوگوں کو سمجھا رہے تھے بلکہ ایک عینی شاہد کے مطابق یوں سمجھئے کہ لوگوں کی منت سماجت کر رہے تھے، ''آپ نیک لوگ ہیں، میں تو گناہگار آدمی ہوں۔۔۔''

ڈپٹی انسپکٹر جنرل کیپٹن ریٹائرڈ سید احمد مبین کو اکثر اپنی مٹی کی محبت میں ایسے ایسے قرض بھی چکانے پڑے جو کبھی واجب بھی نہیں تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ احترامِ انسانیت میں اٹھایا ہوا ہر قدم

عبادت ہے۔اس عبادت کے لئے وہ ہمہ وقت رضا کارانہ طور پر پیش پیش ہوتے،وہ بے گناہ انسانوں کے قتل پہ بہت کڑھتے تھے،وہ اعلان کر چکے تھے کہ میں اپنے دین اور وطن کے تحفظ میں اپنی صدا بلند کرتے کرتے جہان فانی سے کوچ کر جاؤں گا۔

پھر اس کے بعد شہر میں ناچے گا ہُو کا شور

میں آخری صدا ہوں، مجھے مار دیجیے!

(شہید کی فیس بک سے)

اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور امن ومحبت کا یہ راہی اپنے قریبی ساتھی زاہد گوندل ایس ایس پی آپریشنز،دیگر چار اہل کاروں اور سات مظاہرین سمیت راہیِ ملک عدم ہوا۔پاکستان کے دل اور زندہ دلان لاہور کے شہر میں قیامت صغریٰ بپا ہو چکی تھی،اب کی بار قضا نے سید مبین کو مہلت نہ دی تھی،بس ان کی صدائے امن گونج رہی تھی۔

بارود کا نہیں میرا مسلک درود ہے

میں خیر مانگتا ہوں، مجھے مار دیجیے !

(شہید کی فیس بک۔ 23 جنوری 2017)

ہُو کا شور سچ مچ ناچنے لگا تھا،امن ومحبت کے پھول بانٹنے والا اور لوگوں کی خوشیوں کا داعی، سیکڑوں گھروں کا رازدار کفیل،ماں کا واحد سہارا اور تین بیٹیوں کا بابل،شہید خاندانوں کا ہمراز و غمخوار اور اپنی سپاہ کا سگے باپ جیسا سایہِ عاطفت،بیوی کا کبھی نہ لڑنے والا دوست اور پیار کرنے والا سرتاج اور ننھے لخت جگر محمد طہٰ فرید کا ہر دلعزیز بابا،اب شہادت کا جام پی کر خاموش ہو گیا تھا۔

شہادت کی خبر نشر ہوتے ہی سید احمد مبین شہید کے کورس میٹوں اور ساتھی آفیسرز کا تانتا بندھ گیا تھا،سبھی ماں کے گرد جمع تھے۔سید احمد مبین کے والد گرامی اور ان کی والدہ کے رفیق حیات ڈاکٹر کرار حسین 15 سال پہلے داغ مفارقت دے چکے تھے لیکن مبین نے اپنی ماں کو ایک پل بھی احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ تنہا ہو گئی ہیں،یہاں تک کہ وہ خود کو بیوہ ہی نہیں سمجھتی

تھیں ۔اب اکلوتے بیٹے کی شہادت ان کے لئے نا قابل برداشت صدمہ ہونا چاہئے تھا، اس لخت جگر کی شہادت جوان کا مونس وغم خوار ہی نہیں زندگی کے نشیب وفراز اور مسائل کا واحد امرت دھارا تھا۔ان کے قریبی دوست اور جے سی بی کے کورس میٹ لیفٹیننٹ کرنل افتخار نے ہمت کر کے ماں سے بیٹے کے کھوجانے کی بات کی توصبر واستقامت کی دیوی بولیں: ''کیا ہوا، میرا ایک مبین وطن کے کام آ گیا، اللہ نے اتنے سارے مبین، میری قوم کے بیٹے مجھے عطا کر دیئے ہیں اور مجھے شہید کی ماں ہونے کا اعزاز بخشا ہے ۔الحمد للہ!''

شہید کی اکلوتی بڑی بہن سیدہ ثروت قسیم اور مبین کا ساتھ ایک بہن بھائی سے زیادہ دوستوں جیسا تھا ۔بچپن لڑکپن اور نوجوانی سے لے کر اتنی بڑی ذمہ داریوں تک سبھی مراحل پر احمد مبین اپنی بہن کی مشاورت کو خاص اہمیت دیتے تھے۔''بھائی کے ساتھ تو میری اتنی یادیں ہیں کہ بتانے لگوں تو ہفتوں میں بھی ختم نہ ہوں، مبین کہنے کو تو میرا بھائی تھا لیکن وہ میرا بچپن کا دوست اور ابا جان کی رحلت کے بعد تو بابل بھی وہی تھا۔''

تعزیت کرنے والوں میں عیسائی اور ہندو مذاہب کے لوگ بھی موجود تھے۔ان کا کہنا تھا کہ ڈی آئی جی سید احمد مبین ان کے لئے ایک مہربان اور مددگار شخصیت تھے جوان کی کمیونٹی کے مسائل بھی حل کرتے اور ذاتی معاملات میں بھی مدد کرتے تھے، وہ صرف مسلمانوں کے نہیں تمام ہم وطن شہریوں کے ہمدرد وغمگسار تھے ۔یہ سید احمد مبین کے والد ڈاکٹر کرار حسین کی اعلیٰ تربیت کا کمال تھا کہ سید احمد مبین ایک سعادت مند بیٹے، مخلص بھائی، بہترین شوہر، شفیق باپ اور انتہائی بردبار آفیسر ثابت ہوئے تھے، ان کا معمول تھا کہ وہ گھر پہنچتے ہی ایک گھنٹہ اپنے ننھے شہزادے کے ساتھ کھیلتے، بیٹیوں کو پیار کرتے اور پھر بچوں کے ساتھ مل کر اپنے ننھے ننھے پیارے پیارے رنگ برنگے پرندوں کی دیکھ بھال کرتے ۔شاعری کے دلدادہ تھے۔فطرت نے مبین کی شخصیت میں ایک خاص جاذبیت اور انسیت پیدا کر دی تھی ۔وہ اپنی اہلیہ سیدہ آمنہ سے کبھی الجھتے نہ تھے، بلکہ اگر کوئی دوسرا دوست اپنے اہل خانہ سے درشت لہجے میں ہم کلام ہوتا تو اسے سمجھاتے اور

خاندانوں کو جوڑنے کا کام کرتے تھے۔ان کی اہلیہ کو جہاں اپنے سرتاج کی قربانی پر ناز ہے وہیں ان کا دل اتنے بڑے خلا کو برداشت کرتے کرتے ڈوب سا جاتا ہے،ان کی تو ساری دنیا ہی سید احمد مبین تھے۔سیدہ آمنہ کہتی ہیں:''جو شخص غیروں کے لئے مجسمہ شفقت وہربانی اور غموں کا مداوا ہو اس کا برتاؤ اپنی رفیقہ حیات کے ساتھ کیسا ہوگا!''

سید مبین کو اپنے متعلقین میں اعتدال رکھنے میں خاص کمال حاصل تھا۔ماں کا مقام، خوشدامن کا وقار، بہن کا پیار، بیوی کا استحقاق،لختِ جگر کا لاڈ اور دختران نیک اختر کے ناز نخرے سبھی کی فکر کرتے اور سبھی کے حقوق بدرجہ اتم پورے کرتے تھے۔اللہ نے انھیں تین بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا تھا۔بڑی بیٹی حبہ مبین آج ایم بی بی ایس کر رہی ہے جبکہ چھوٹی دونوں عبیرہ مبین اور دعا مبین بنیادی تعلیم کے مراحل طے کر رہی ہیں۔سیدہ آمنہ بتاتی ہیں،'' جب اللہ نے یکے بعد دیگرے تین بیٹیاں عطا کیں تو میرے چہرے پر ملال کی پرچھائیاں پڑھ کر مبین نے فورا مجھے حوصلہ دیا اور کہنے لگے کہ اللہ نے ہمیں جنت کی سند عطا کی ہے،اللہ کا شکر ادا کرو اور خوب خوشیاں مناؤ۔''

کوئی ساتھی ان سے مشورہ چاہتا یا کسی قسم کی مدد کی درخواست کرتا تو اسے اپنے پاس بلاتے،گھر پر آنے اور قیام کرنے کی دعوت دیتے،اس کا مسئلہ حل کرتے،اگر مالی معاونت مانگے تو بلاتردد اس کی ضرورت پوری کرتے۔اپنے ساتھی شہید ڈی آئی جی فیاض سنبل کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے اور ان کی ضرورتوں کا بدرجہ اتم خیال رکھتے۔ایک بار ایک کانسٹیبل نے انھیں بتایا کہ اس کے بیٹے کے دل میں سوراخ ہے اور بیرون ملک علاج کے لئے 20 لاکھ روپے درکار ہیں تو آپ نے اسے کہا کہ بسم اللہ کرو،اللہ مدد کرے گا۔چنانچہ آپ کی کوشش سے بچے کا علاج بخیر وخوبی ہوگیا اور جب وہ کانسٹیبل سید احمد مبین کا شکریہ ادا کرنے لگا تو بولے،''اس رقم کا تعلق نہ تو پولیس فنڈ سے ہے اور نہ کسی ناجائز ذرائع سے اور نہ ہی میں نے جیب سے خرچ کیا ہے یہ تو اللہ کی مدد سے میرے ایسے مخیر دوستوں نے مہیا کی تھی جو تمھیں جانتے بھی نہیں،تم بس ان کے

لئے دعا کردو۔'' اسی طرح ایک کورس میٹ کے بیٹے کو جب بیرون ملک سنگاپور میں علاج کے لئے رقم کی ضرورت پڑی تو سب سے بڑا حصہ سید احمد مبین نے ڈالا اور منتظم کو سختی سے منع کیا کہ کسی کو پتا بھی نہ چلے۔ اپنی فوجی یونٹ 42 بلوچ 'الحاوی بٹالین' کے لئے ان کے دل میں خاص مقام تھا۔ الحاوی کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل جمیل نے بتایا کہ ڈی آئی جی کیپٹن ریٹائرڈ سید احمد مبین اپنی یونٹ کو کبھی نہیں بھولتے تھے اور سولجر سے لے کر سویلین کنٹریکٹرز تک سب کو پوری توجہ اور عزت دیتے تھے۔ صوبیدار میجر رخسار بتاتے ہیں کہ جب بھی کوئی کیپٹن مبین کو ٹیلیفون کرتا تو لازمی جواب دیتے اور اگر فورا فون نہ اٹھا سکیں تو جوابی فون کرتے اور ساتھ معذرت بھی کرتے۔ یونٹ میں ان کے ابتدائی ایام کا ذکر کرتے ہوئے صوبیدار میجر رخسار صاحب کہتے ہیں، '' مجھے کیپٹن مبین صاحب کو ہتھیاروں کی تربیت دینے کی ذمہ داری ملی تو کیپٹن مبین آفیسر ہونے کے باوجود ایک شاگرد کی طرح زمین پر دری بچھا کر میرے سامنے بیٹھ جاتے اور استاد جیسا احترام دیتے تھے۔'' یونٹ کے سبھی آفیسرز اور سولجرز ان پر جان چھڑکتے تھے، جب شہادت کی خبر پہنچی تو 'الحاوی' کی اعزازی گارڈ کا دستہ ایک گھنٹے میں شہید کے اعزاز میں پہنچ چکا تھا۔

سید احمد مبین نے اسلامیہ ہائی سکول میکانگے روڈ کوئٹہ سے میٹرک کرنے کے بعد 1988 میں جے سی بی میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ شروع میں وہ کافی کمزور لیکن ہنس مکھ کیڈٹ تھے۔ بریگیڈیئر ارشد سیال ان کے جے سی بی کے پلاٹون میٹ ہیں، وہ بتاتے ہیں: ''ہم مبین کو اس کی نازکی پر چھیڑتے تھے، وہ بظاہر ہنس دیتا لیکن اس کی خودی کا کمال تب نظر آیا کہ جب پی ایم اے میں پہنچتے ہی مبین نے ایک نیا رخ اختیار کیا، جیسے اچانک کوئی نئی روح اس کے اندر عود کر آئی ہو، وہ نہ صرف تعلیمی میدان میں جھنڈے گاڑھنے لگا تھا بلکہ جسمانی کھیلوں اور مشقوں میں بھی سب کو مات کرنے لگا تھا۔ لیکن اپنے ساتھیوں کی طرف اس کا رویہ مثالی تھا، اکثر ان کی جگہ بڑی سے بڑی قربانی پیش کر دیتا، ایک بار اپنی پلاٹون کے ایس جی سی (سینئر جنٹلمین کیڈٹ) کے طور پر پوری پلاٹون کی غلطی کو اپنے سر لے لیا اور سزا کے طور پر رات بھر گورکھا حالت میں رہنا پڑا، ایک

اور موقع پر جب سینیئرز کے رگڑے سے کمر پر گہرے زخم خراب ہو گئے اور ڈاکٹر نے جاننا چاہا کہ زخم کیسے ہوئے تھے تو ڈٹ گیا اور سزا دینے والے کیڈٹس کے نام نہ بتائے۔"

سینئر ٹرم میں سید احمد مبین سی ایس ایم (کمپنی سارجنٹ میجر) بن گئے، ان کے ایک اور کورس میٹ میجر ارمغان نعیم نے بتایا کہ جب ہم جونیئر ٹرم میں تھے تو اکثر مبین بھاگتا ہوا آتا اور کہتا، اوئے بھاگو! سی ایس ایم آ رہا ہے اور پھر ایسا غائب ہوتا کہ سی ایس ایم بھی ڈھونڈ نہ پاتا۔ جب خود سی ایس ایم بنا تو کوئی اس سے بچ نہ سکتا تھا۔

سید احمد مبین نے 17 اپریل 1992 بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ پاک فوج کی مایہ ناز الجاوی' بٹالین، بلوچ رجمنٹ میں کمیشن حاصل کیا اور پھر یکے بعد دیگرے اپنے تربیتی کورسوں میں نمایاں پوزیشنز حاصل کرتے گئے۔ کپتانی کے ستارے سجانے کے بعد 1995 میں سیدہ آمنہ بخاری کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ اسی دوران آپ کے انٹیلی جنس کورس کی وجہ سے آپ کو پاکستان رینجرز سندھ میں شرپسند عناصر کے خلاف فیلڈ سکیورٹی کی خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ یہ دراصل آپ کی بنیاد تھی جس میں آپ نے انتہائی کامیابی سے سکیورٹی کے فرائض ادا کرتے ہوئے اعلیٰ تجربہ حاصل کیا۔ یہاں آپ کے کوڈ نام کیپٹن کاکڑ کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ اس دوران آپ کو گولیاں بھی لگیں اور شدید زخمی ہوئے لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے، آپ کے آپریشنز جاری رہے۔ اگلے ہی سال آپ سول سروس کمیشن کا معیار پورا کرتے ہوئے سول سروس اکیڈمی چلے گئے اور پھر پاکستان پولیس میں اے ایس پی کے طور پر لاہور میں تعینات ہو گئے۔ آپ کی اگلی اہم تعیناتی کوئٹہ میں تھی جہاں بطور پولیس آفیسر اغوا برائے تاوان کے متعدد کیس حل کئے۔ در اصل بلوچستان کی سرزمین کا یہ سپوت وطن عزیز کی محبت کا استعارہ بن چکا تھا، سید مبین اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی معمول کے ایک دن میں 18 گھنٹے تک ادا کرتے۔ بعض اوقات تو تین تین دن تک مسلسل آپریشنز میں گزر جاتے اور چھٹی کے دن بھی کام کر رہے ہوتے۔ آپ نے کوئٹہ پولیس کو مایوسی کے اندھیروں اور خوف کی اتھاہ گہرائیوں سے نکالا، ان کی تربیت نو کی، ہر جگہ خود قیادت

کرتے ہوئے ان کے اندر سے موت کا ڈر دور کیا، انھیں ہمت و جرأت عطا کی اور مورال بلند کیا، اپنے زخمی سپاہیوں کے ساتھ پوری پوری رات بتا دیتے، المختصر یہ ان کی غیر معمولی قیادت کا اعجاز تھا کہ کوئٹہ پولیس صرف چھ ماہ کے عرصے میں نہ صرف اپنے پاؤں پہ کھڑی ہوگئی بلکہ علیحدگی پسندوں اور فرقہ واریت پھیلانے والوں حتیٰ کہ دہشت گردوں کے خلاف فوج کی مدد کے بغیر آپریشنز کرنے کے قابل ہوگئی۔ ان کے قریبی ساتھی بریگیڈیئر فیصل نصیر جو ایک طویل دورانیے تک ان کے ہمراہ آپریشنز کرتے رہے اور ابتدائی طور پر بھی ان کے پاکستان ملٹری اکیڈمی کے کورس میٹ ہیں ایک ملاقات میں بتاتے ہیں۔

''سید مبین زیدی دہشت گردوں کے خلاف ایک ہزار سے زائد آپریشنز میں اپنی سپاہ کی قیادت کر چکے تھے، جن میں سے سب سے زیادہ آپریشنز ان کی جنم بھومی بلوچستان میں ہوئے تھے، 2012 میں پشتون آباد (بلوچستان) میں شرپسندوں کے خلاف سکیورٹی فورسز کی دھاک بٹھانے کے بعد کوئٹہ شہر میں مبین (شہید) نے دہشت گردوں کی کمر توڑ دی تھی۔ کوئی رات ایسی نہ تھی جب سید مبین ہمارے ساتھ پوری رات بنفس نفیس باہر نہ ہوں۔ 2013 کے قومی انتخابات کو ممکن بنانے میں مبین (شہید) نے اپنی سپاہ کے ہمراہ اول دستے کا کردار ادا کیا تھا۔ اس وقت کوئٹہ اور نواحی علاقوں میں انتخابات کا انعقاد جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، ہماری خفیہ اطلاعات کے مطابق مشرقی بائی پاس کوئٹہ اور نواح میں دہشت گرد پرامن رہائشی علاقوں میں سرطان کی طرح سرایت کر چکے تھے، آئے دن چھوٹے موٹے دھماکے معمول بن چکا تھا، سید مبین شہید نے میرے دست راست کے طور چار ہزار سپاہ کے ہمراہ چار کلومیٹر تک گھر گھر تلاشی لیتے ہوئے پورے علاقے کو دہشت گردوں سے پاک کرایا، اگرچہ اس وقت انھیں راکٹ حملوں کی واضح اطلاعات بھی مل چکی تھیں لیکن وہ عوام اور انتخابی عملے کی حفاظت کے لئے دن رات خود موجود رہتے حتیٰ کہ انتخابات بخیر و خوبی انجام پائے اور اگلا پورا سال کوئٹہ کا امن مثالی رہا۔ سید مبین فرائض کو ذاتی ذمہ داری سمجھ کر نبھاتے تھے، ایک بار ہمارے کچھ لوگ دہشت گردوں کے چنگل میں پھنس گئے تو مبین ذاتی طور پر

رات کے تین بجے میرے ہمراہ ان لوگوں کو چھڑا کر لائے۔''

کاؤنٹر انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے قیام میں آپ کی خدمات لاجواب تھیں۔اس ادارے کو پنجاب اور بلوچستان میں اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے اور فعال بنانے کے لئے سید مبین شہید نے ترکی اور امریکہ سے جا کر تربیت حاصل کی اور اس ادارے میں جدید ترین اصلاحات نافذ کر کے انھیں عملی جامہ پہنایا۔کوئٹہ کے بعد آپ کو پنجاب میں کاؤنٹر انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ بنا دیا گیا تھا۔آپ وزیر اعلیٰ پنجاب کے مانیٹرنگ سیل کے بھی انچارج رہے اور پھر تا وقت شہادت ٹریفک پولیس میں ڈی آئی جی کے طور پر فرائض ادا کر رہے تھے۔

ڈی آئی جی ٹریفک کیپٹن ریٹائرڈ سید احمد مبین زیدی شہید کی نماز جنازہ میں ملک کی اعلیٰ ترین قیادت،فوج اور پولیس کے سپاہ سالاروں اور ملک بھر کے مذہبی اور سیاسی رہنماؤں نے شرکت کی اور 24 گھنٹے کے اندر اندر خودکش بمبار کے سہولت کار کو گرفتار کر لیا گیا۔دہشت گردوں کے اس گروہ کا تعلق افغانستان سے تھا جبکہ ان کا گرفتار شدہ سہولت کار انوار الحق باجوڑ کا رہنے والا تھا۔پاک فوج اور پولیس نے ملک بھر میں دہشت گردوں کے خلاف'' آپریشن ردالفساد'' کے نام سے بھرپور آپریشن کا آغاز کر کے بہت سے دہشت گردوں کو کیفر کردار تک پہنچایا ہے، یہ آپریشن آخری دہشت گرد کے خاتمے تک جاری رہے گا۔پاکستان نے افغان حکومت سے بھی مطالبہ کیا ہے کہ ان کے ملک میں پناہ گزیں دہشت گردوں کی سرکوبی کی جائے۔

*****

پانچ سال کی کہانی

اہلیہ کیپٹن عاصم کریم شہید

...... ••• ......

10 فروری 2015 میں عاصم کو شہید ہوئے پانچ سال پورے ہو گئے ۔ان پانچ سالوں کے ایک ایک دن نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔ میں شکرگزار ہوں اپنے رب کی اور ان پانچ سالوں کی جس نے مجھے میری عمر کے تیس سالوں کے باقی 25 سالوں سے زیادہ سخت حالات سے گزارا۔ اس پورے وقت کے اتار چڑھاؤ سے مجھے لگا کہ اب میں بہت کچھ سیکھ گئی ہوں اور مجھے اللہ کے سوا کسی اور کے سہارے کی ضرورت نہیں لیکن ۔۔۔

شادی کے ساڑھے تین سالوں میں تو میں نے صرف شوہر کا پیار ہی دیکھا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میرا کام صرف شوہر کے لئے اچھے اچھے کھانے پکانا، صبح صبح ان کے لئے ملک شیک بنانا، یونیفارم، جرابیں، مفلر، ٹوپی، چیک لسٹ اور گاڑی کی چابی لا کر دینا اور جب تیار ہو جائیں تو گھر کے ٹیرس سے ان کو آفس جاتے ہوئے دیکھنا ۔میاں کی ضروریات کا خیال رکھنا، ان کو تنگ کرنا، ملازم سے کام کروانا اور ضرورت کی چیزیں منگوانا جبکہ شوہر کا کام تنخواہ لا کے ہاتھ میں رکھنا اور کہنا بیگم اب پورا مہینہ اس سے چلانا ہے۔ان کے ساتھ جا کر گھریلو خریداری کرنا اور ڈیوٹی سے آنے کے بعد گھر کی Maintenance کی لسٹ پکڑا دینا۔ NCB کی شکایت لگا کر اس کے کان کھنچوانا اور اس کو نظم وضبط سمجھانا ۔

ان ساڑھے تین سالوں میں کوئی لڑائی تو یاد ہی نہیں۔ ویک اینڈ پہ فلم اور پیزا لا کر مووی نائٹ منانا۔ ذرا پہلے آ جاتے تو جوس پینے چلے جانا یا پھر آئسکریم کھانا۔ اسی کو دنیا کی سب سے بڑی خوشی سمجھنا تھا۔ زیادہ پیسوں کے بارے میں تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا نہ مانگے تھے۔ صرف ایک دوسرے کے ساتھ گزارے گئے تنخواہ والے دن سے بہتر سمجھتے تھے۔ سالگرہ کا تحفہ ایک دوسرے سے ضرورت کی چیز پوچھ کر دیتے تھے۔ وہی بہترین سرپرائز ہوتا تھا جب اللہ سے کوئی چھوٹی چیز مانگی ہوتی تھی اور وہ سالگرہ کے تحفے کی صورت میں مل جاتی تھی۔ ابھی تو ساڑھے تین سالوں میں بچت کے بارے میں سوچا نہیں تھا۔ پھر یہ پانچ سال شروع ہو گئے جب پہلے ہی سال میں رشتے سمجھ میں آ گئے۔ اپنا اور پرایا دوست اور تماشائی کا فرق سمجھ میں آیا۔ پہلے ہی سال میں شفٹنگ کا بوجھ پھر تنہا گھر سیٹ کرنا۔ اس دن بڑا روئی تھی جس دن اے سی لگوانا تھا۔ میں جب اپنے MOQ گئی تھی تو گھر سیٹ اور اے سی لگا ہوا ملا تھا۔ سب کہتے تھے، یوں ہی پریشان ہوتی ہو، یہ تو الیکٹریشن کا کام ہے۔ اسے بلواؤ اور وہ اپنا کام کر دے گا۔ میری ذہنی پریشانی تو فضول ہی لگتی تو میں خاموش رہ گئی۔ یو پی ایس لیا، بیٹری لی، گھر سیٹ کیا، اس کے بعد کار لی، سب کہتے تھے ہر کوئی لیتا ہے۔ اس میں پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے علم ہے کہ صرف پیسے دے کر گاڑی گھر نہیں آ جاتی، پورا پروسس ہوتا ہے۔ جاب شروع کی، مل جمع کرانا، گھر اکیلے چلانا سیکھا تو پانچ سال پورے ہوئے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ این سی بی اور فلیٹ واپس کر دوں۔ کیا کوئی ملازم رکھوں؟ کسی پہ اعتبار کر سکتی ہوں؟ یہ میں تو اپنی ذمہ داری پر رکھوں گی، کوئی گارنٹی نہیں دے گا۔ اچھا ہے نہ رکھوں گزارا ہو جائے گا۔ لیکن وقت بے وقت ضرورت پڑ سکتی ہے۔ کیا مکینک کے پاس خود جاؤں گی؟ الیکٹریشن، پلمبر خود ڈھونڈوں گی یا کسی پر بوجھ بنوں گی؟ یہ بیڈ روم اور کرسیاں ان کو بہت پسند تھیں۔ یہ پھول MOQ میں پہلے دن شفٹ کیا تھا تو وہ لے کر آئے تھے۔ یہ قالین ہم دونوں نے مل کر خریدے تھے اور ڈائننگ ٹیبل پر اکٹھے کھانا کھاتے تھے۔ یہ Wooden Floor Lamp اپنی پہلی بچت سے لی تھی اور یہ ہوم تھیٹر ہم نے کریڈٹ کارڈ سے لیا تھا۔ ان کا گنا رمیں

نے اپنی Teaching کی تنخواہ میں سے ان کو گفٹ کیا تھا۔ ان کو گنا ر بہت پسند تھا اور یہ ڈریسنگ ٹیبل اس میں ہم صبح ساتھ تیار ہوتے تھے لیکن یہ چیزیں تو میں سوچ رہی ہوں کیا کوئی اور بھی میری طرح سوچتا ہوگا۔ یہ چیزیں سن کر شاید لوگ میرا مذاق اڑائیں۔ میں تو دنیا کے سامنے بہت مضبوط عورت ہوں۔ مجھے تو لگتا تھا کہ میں نے اکیلے رہنا سیکھ لیا اور کوئی بھی کام مشکل نہیں لیکن آج مجھے ایسے لگتا ہے کہ پانچ سال بعد میں پھر اس جگہ آن کھڑی ہوئی ہوں اسی جگہ کھڑی ہوں جہاں سے بہت سے راستے نکلتے ہیں لیکن مجھے نہیں پتا کس راستے پر جاؤں لوگ کہتے ہیں یہ تو کوئی بڑی بات نہیں۔

*****

پھر کسی بچھڑے مسافر کی کہانی لکھنا

جبار مرزا

.....•••.....

فرخ مرزا شہید کو جب لحد میں اتارا گیا تو وہ پاکستانی پرچم میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کی زندگی کا مقصد اور آخری آرزو یہی تھی۔ عجیب وجدانی نوجوان تھا، شہادت سے چند دن پہلے سارے بہن بھائیوں عزیز و اقربا سے ملنے شہروں شہروں ان کے گھروں کو گیا۔

لاہور میں چھوٹے بھائی کے دوستوں نے پوچھا، ''آپ نے فوجی زندگی کا انتخاب کیوں کیا؟'' فرخ مرزا نے جواب دیا، ''میں اعزاز کے ساتھ فوجی پرچم میں لپٹا ہوا دنیا سے جانا چاہتا ہوں۔'' تمنائیں کس قدر بر آتی ہیں، ہم اور آپ اس خدائی بھید کو کیا جانیں۔ 25 دسمبر 1995 کو واہ کینٹ کا لالہ زار قطعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ہر گھر روشن تھا، ہر سر فخر سے بلند تھا، واہ اور گرد و پیش کی بستیوں کے مقیم سخت سردی میں جوق در جوق فرخ شہید کو خراجِ تحسین پیش کرنے پہنچے ہوئے تھے۔ لالہ رخ کے مرکزی قبرستان میں جب مٹی کی امانت پورے فوجی اعزاز کے ساتھ مٹی کے حوالے کی گئی تو علاقہ عنبر و عود میں ڈوب گیا۔ گارڈ آف آنر، چیف آف آرمی سٹاف کی طرف سے بھجوائے گئے پھول، 12 سندھ بٹالین اور بٹالین کمانڈر کی طرف سے پھولوں کی چادریں، پی ایم اے کاکول کے پھول، چیئرمین واہ فیکٹری کا اظہارِ عقیدت، بہاولپور کے GOC کے پھول، کیڈٹ کالج حسن ابدال کے پھول، دوست احباب، خاندان، گھر اور اہلِ علاقہ کے پھول،

الغرض!فرخ مرزا شہید کی لحد خوشبوں میں ڈوب گئی ۔ یہ وہی خوشبو تھی، جس کی آرزو فرخ مرزا نے کی تھی ۔ یہ اسی خواب کی تعبیر تھی جو شہید نے وردی پہنتے وقت دیکھا تھا۔

فرخ مرزا ابھی فوج کے ابتدائی عہدوں پر تھا مگر تدفین کے اگلے روز اس وقت کے آرمی چیف جنرل آصف نواز جنجوعہ، شہید کی تربت کو سلیوٹ پیش کرنے لالہ رخ پہنچے ہوئے تھے، ماحول میں ہر سُو پھول ہی پھول پھیلے ہوئے تھے ۔ یہ وہی اعزاز تھا، وہی پھول اور خوشبو تھی جس کی تمنا لے کر فرخ نے دفاعِ وطن کے راستے کا انتخاب کیا تھا ۔ وہ فوج میں لیفٹین تھا، کپتانی کی وردی سل کے آ چکی تھی مگر فرخ مرزا نے شہادت کا کفن پہن لیا، بھلا اس سے خوبصورت پیراہن اور کیا ہوسکتا تھا۔ جس طرح ہیرو بنائے نہیں جاتے وہ پیدائشی ہیرو ہوتے ہیں، بعض خاندان اور گھرانے بھی ایسے ہوتے ہیں جہاں سے شہیدوں اور غازیوں کا انتخاب ہوتا رہتا ہے۔

فرخ شہید کا گھرانہ علاقے میں ''کپتاناں والا خاندان'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ شہید کے دادا فضل حسین مرزا فوج میں تھے ۔ دوسری جنگِ عظیم میں اعلیٰ سپہ گری کی بنا پر دینہ ضلع جہلم کے قصبے ناہلیاں والا میں انعام میں ان کو زمین ملی تھی ۔ فرخ شہید کے والد محمد خلیل مرزا جن کی وفات 18 جون 2004 میں ہوئی، وہ بھی افواجِ پاکستان کے ادارے پاک فضائیہ میں تھے ۔ خلیل مرزا کے چچا اور بڑے بھائی محمد رفیق مرزا بھی فوج میں تھے اور کپتان تھے ۔

فرخ مرزا شہید کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ ان کے خاندان کی ہر شاخ میں حافظ قرآن موجود ہیں ۔ فرخ بھی اپنے گھریلو ماحول سے خاصا متاثر تھا ۔ باجماعت نماز کے لئے مسجد جانا، باقاعدگی سے روزے رکھنا بلکہ دوستوں کے ساتھ سحری میں لوگوں کو جگانا بھی معمول اور نعتیں پڑھنا پسندیدہ عمل تھا ۔ روحانیت اس خانوادے کی شناخت ہے ۔ فرخ مرزا کو گھر میں سبھی چھوٹے بڑے ٹیپو کہا کرتے تھے ۔ اتفاق دیکھئے کہ 87 لانگ کورس میں کمیشن کے بعد پی ایم اے کاکول میں جو کمپنی ملی، اس کا نام بھی ٹیپو ہی تھا ۔ 15 اپریل 1993 کو گریجویشن کی تکمیل ہوئی، پاسنگ آؤٹ پریڈ میں فرخ مرزا کے والد محمد خلیل مرزا اور والدہ نسیم اختر دونوں گئے ہوئے تھے ۔ سیکنڈ

لیفٹیننٹ کے طور پر پہلی تقرری فرخ مرزا کی انفینٹری کی سندھ رجمنٹ کی بارہ بٹالین میں ہوئی جوان دنوں خیبر پختون خوا کے علاقے ٹل میں تھی۔فرخ مرزا تین بھائی اور سات بہنیں ہیں۔

ان کی والدہ کا خاندان تجارت پیشہ تھا فرخ مرزا کے پڑنانا نے افغانستان سے کشمیر ہجرت کی تھی، وہ آئے تو کاروباری سلسلے میں تھے مگر پھر یہیں کے ہوکر رہ گئے اور قیام پاکستان سے تھوڑا پہلے اس خاندان نے جہلم کو اپنا مسکن بنایا۔فرخ مرزا کے نانا مرزا علم دین 105 برس کی عمر میں جہلم میں بقیدِ حیات ہیں۔ان دنوں اس خاندان کا قیام واہ فیکٹری کے نمبر 20 ایریا میں تھا۔فرخ مرزا کی ولادت سے علاقے میں شادکامی پھیل گئی۔گردوپیش کے لوگوں میں لڈو بانٹے گئے۔فرخ مرزا اوائل عمری سے ہی چاق چوبند، ہوشیار، چست، صحت مند، خوبصورت اور انوکھا تھا۔

فرخ مرزا کسی بات پر پریشان یا مایوس کبھی نہیں ہوتا البتہ جب پہلی مرتبہ یعنی پہلے سال فوج میں کمیشن نہ ملا تو وہ پریشان ہوا اور کافی دنوں بعد نارمل ہوا اور شدت سے اگلے سال کی سلیکشن کا انتظار کرنے لگ گیا۔یوں پھر اگلے سال کمیشن کے لئے منتخب ہوکر کاکول چلا گیا۔فرخ مرزا جب پہلی بار مورچے میں اترا تو اس وقت وہ پونے تین سال کا تھا اور شہادت کے وقت پونے ستائیس سال کا تھا۔درمیان کے برسوں میں ابتدائی تعلیم ایف جی گرلز ہائی سکول نمبر 2 واہ کینٹ سے، میٹرک ایف جی بوائز ماڈل ہائی سکول واہ کینٹ اور فیڈرل بورڈ سے جبکہ ایف ایس سی حسن ابدال کیڈٹ کالج راولپنڈی بورڈ سے کی۔فرخ مرزا پونے تین سال کی عمر میں مورچے میں تب اترے جب 1971 کی پاک بھارت جنگ شروع ہوئی تھی۔ایک رات خطرے کا سائرن بجنے پر گھر میں بنائے گئے مورچے میں گھر کے سارے افراد اترے تو فرخ مرزا اپنے سے ساڑھے تین سال بڑی بہن ثمینہ مرزا کی گود میں تھے۔اسی اثنا میں بھارتی طیارے نے بم گرایا۔بظاہر وہ پاکستان کی اسلحہ فیکٹری واہ کا نشانہ لینے کی غرض سے آیا تھا۔مگر اس کا نشانہ خطا گیا اور وہ بم واہ اور حسن ابدال کے درمیان کھلی زمین میں گرا جس سے کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔بھارت کے اس طیارے کو راولپنڈی چکلالہ کے قریب گرا دیا گیا تھا۔اسی روز بھارت کے ایک طیارے نے

لاہور کے محلہ مصری شاہ پر بم گرائے تھے جس سے 8 شہری شہید اور 28 زخمی ہوئے تھے۔انسانی آبادیوں پر بم گرانا بھارت کی اخلاقی پستی کی غمازاور بین الاقوامی ضابطوں کی سریحاً خلاف ورزی ہے۔اس واقعے کی تفصیل فرخ مرزا کی بڑی بہن ثمینہ مرزا کی کتاب پرچم میں لپٹا بھائی میں پڑھنے کو ملے گی جو زیرطبع ہے۔

فرخ مرزا نے اپنی شہادت سے ایک دن پہلے ثمینہ مرزا کے خواب میں آ کرانہیں ایک لفافہ دیا۔بہن نے پوچھا،''اس میں کیا ہے۔''فرخ نے کہا،'' تمہارا کینیڈا کا ٹکٹ اور تم؟'' بہن نے پھر پوچھا،''فرخ نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں اوپر جارہا ہوں' اور پھر بہاولپور میں فوجی مشقوں سے واپسی پر 25 دسمبر 1995 بروز پیر مطابق 2 شعبان 1416 ہجری زیرزمین گولہ (Unexploded bomb) پھٹنے سے 5 فوجی افسر شہید ہوئے جن میں ایک فرخ مرزا بھی تھے۔فرخ مرزا کی بڑی بہن جو عمروں میں بہت کم فرق ہونے کی وجہ سے ہمیشہ فرخ مرزا کے ساتھ ساتھ ہی رہی جنہیں اسلام آباد کے تعلیمی ادارے پروفیسر ثمینہ فرخ مرزا کے نام سے جانتے ہیں اور پاکستان کے ادبی،علمی اور سماجی حلقے ثمینہ تبسم کے نام سے شناسا ہیں جو تین کتابوں کی مصنفہ ہیں۔شاعرہ،ادیبہ پروفیسر ثمینہ تبسم نے بتایا کہ ماں کے سوچنے کا انداز گھر کے دیگر لوگوں سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ایک روز امی کہہ رہی تھیں کہ سب بچے آباد ہیں، گھربار والے اور بچوں والے ہیں مگر میرا ٹیپو تو ایسے ہی چلا گیا۔تو میں نے کہا کہ امی ہم سب نے مرجانا ہے،فنا ہوجانا ہے۔مگر ٹیپو شہید ہے،وہ زندہ ہے۔اسے جب قبر میں اتارا تو پاکستانی پرچم میں لپٹا ہوا تھا،وہ جب شہید ہوا تو وردی میں تھا۔''اماں! ٹیپو نے وردی پہنتے وقت اس ملک کے دفاع کی قسم کھائی تھی جو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا،شہید زندہ ہوتا ہے ماں۔''یہ تو اللہ کا وعدہ ہے کہ ہم اگر ٹیپو کو بھول بھی جائیں تو تاریخ اسے یاد رکھے گی۔اس لئے کہ وہ زندہ ہے۔وہ مقیم ہے،ہم مسافر ہیں۔ہمارا قیام،شہرت اور دنیا سب عارضی ہے۔وہ ہمیشہ رہے گا، جب تک کائنات ہے وہ زندہ ہے۔

ثمینہ تبسم جب فرخ مرزا کے حوالے سے بتا رہی تھیں تو ان کے لفظوں میں تمکنت تھی، حوصلہ، جذبہ اور اظہار میں دبدبہ تھا لیکن وہ اس بات پر حیران تھیں کہ ہمارے کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میں کینیڈا پہنچ جاؤں گی ۔پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ میں شہید بھائی کا دیا ہوا پردیس کاٹ رہی ہوں ۔ڈھیروں باتیں ہیں جو میں اس سے کیا کرتی تھی ۔اب وہ ساری باتیں میں اس سے کتاب میں کروں گی ۔ممتاز مصنفہ اور شاعرہ محترمہ تسنیم کوثر نے شاید کسی ایسے لمحے کے لئے ہی کہا تھا کہ

کھولنا جب کبھی گزرے ہوئے لمحوں کے کواڑ
صبح ارمان بھری، شام سہانی لکھنا
پہلے رکھ دینا چراغوں کو سرِ راہ گزر
پھر کسی بچھڑے مسافر کی کہانی لکھنا

*****

لیفٹیننٹ طیب سے لیفٹیننٹ ارسلان تک

بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) فیصل مسعود

.....•••.....

لیفٹیننٹ ارسلان عالم شہید کی شہادت جہاں ہم سب کے لئے بحیثیت پاکستانی باعثِ فخر ہے وہیں اس نوخیز خوبصورت نوجوان افسر کی بے وقت رخصت پر قوم بجا طور پر دل گرفتہ بھی ہے۔

پاکستان آرمی میں 32 سالہ کمیشنڈ سروس کے دوران مجھے بھی اپنے بیشتر ساتھیوں کی طرح پاکستان کے قبائلی علاقہ جات میں دہشت گردوں کے خلاف تقریباً دو عشروں پر محیط جنگ کا حصہ بننے اور عزم و یقین سے آراستہ لازوال قربانیوں کے ان گنت ناقابل فراموش واقعات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اکتوبر 2001 میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پانے کے بعد کسی یونٹ کی کمان خالی نہ ہونے کی وجہ سے مجھے عارضی طور پر اے ایس سی سکول تعینات کر دیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب پاکستان دو اطراف سے روائتی و غیر روائتی جنگ کے مہیب سایوں میں گھر چکا تھا۔ مشرق میں ہمارا روائتی دشمن جنگی ساز و سامان کی برتری کے زعم میں مبتلا، حیلوں بہانوں سے مسلسل ہم پر دباؤ بڑھا رہا تھا جبکہ دوسری طرف مغرب میں دہشت و وحشت کا آسیب پر پھیلائے ابھر رہا تھا۔ افغانستان میں امریکی بمباری عروج پر تھی اور طالبان کی حکومت تہہ و بالا ہو چکی تھی۔

2002 کے وسط میں پارلیمنٹ پر دہشت گردوں کے حملے کی آڑ میں بھارت نے اپنی

فوج کا ایک بڑا حصہ پاکستان کے ساتھ سرحدوں پر تعینات کر دیا۔ بحیثیت ایک پاکستانی مشرقی سرحد پر منڈلانے والے خطرات کے بارے میں ہم میں سے کسی کے ذہن میں کسی قسم کا کوئی شائبہ یا ابہام نہیں تھا۔ مغرب کی طرف صورت حال تاہم مختلف تھی۔ دوست اور دشمن کی پہچان میں بے یقینی کی کیفیت کو مخصوص عناصر اپنے منفی پراپیگنڈے سے مزید دھندلا رہے تھے۔ وطن اور اسلام کے نام پر مر مٹنے والی سادہ لوح قوم کے اخلاص سے گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔

میں نے اکتوبر 2002 میں یونٹ کی کمان سنبھالی تو ہم مشرقی سرحد پر تعینات تھے۔ مارچ کے اوائل میں صدر پاکستان نے اپنی سرزمین کسی بھی ملک کے خلاف دہشت گردی کے لئے استعمال ہونے کی اجازت دینے سے انکار کا اعلان کیا جسے اقوام عالم میں فوری پذیرائی ملی۔ بھارت کے لئے اب پاکستان پر مزید دباؤ بڑھانا ممکن نہ رہا تھا۔ تاہم بھاری بھرکم جنگی مشین جسے وہ مہینوں کی مشقت سے پاکستان کی سرحد پر کھینچ تان کر لایا تھا، اس کی یکسر واپسی کا اعلان، بھارتی قیادت کے لئے فوری ممکن نہ تھا۔ آخر اپنے سادہ لوح عوام کے کروڑوں روپے کے اخراجات اور مہینوں پر محیط مہم جوئی کا مناسب جواز پیش کرنا آسان نہ تھا۔

نومبر 2002 کے اوائل میں بال آخر دونوں ملکوں نے اپنی اپنی افواج کی چھاؤنیوں میں واپسی کا دوطرفہ فیصلہ کیا اور یوں وہ یونٹ جس کی کمان سنبھالے مجھے محض دو ماہ کا عرصہ ہوا تھا، زمانہ امن کے مقام کوہاٹ پہنچ گئی۔ کوہاٹ واپسی پر ایک عام تاثر تھا کہ جنگ کے بادل چھٹ چکے ہیں۔

ہماری مشرقی سرحد پر تعیناتی کے دوران افغانستان میں امریکی حملے کے بعد طالبان کی حکومت تتر بتر ہو چکی تھی۔ بیشتر افغان عسکریت پسند اور ان کے اتحادی پاکستان سے ملحقہ اور پاکستان کے اندر قبائلی علاقہ جات میں روپوش ہو چکے تھے۔ اگرچہ فضا میں تناؤ تھا لیکن روپوش عسکریت پسندوں اور بالخصوص قبائلی عوام اور پاک افواج اور ایف سی میں بہرحال ٹکراؤ کی بظاہر کوئی کیفیت نہیں تھی۔ قبائلی علاقہ جات میں آمد و رفت بغیر کسی روک ٹوک یا سنجیدہ حفاظتی

اقدامات کے جاری تھی۔ کسی چھاپہ مار کارروائی یا بارودی سرنگوں سے حملوں کے طریقہ کار کے مطابق میں اپنے ذمہ داری کے علاقوں بشمول کرم ایجنسی، شمالی وزیرستان اور جنوبی وزیرستان کے دوردراز علاقوں سے واقفیت حاصل کرنے کے سفر پر نکل پڑا۔

گو کہ قبائلی علاقہ جات میں پرتشدد واقعات کا ابھی آغاز نہیں ہوا تھا تاہم پاک فوج کی قبائلی علاقہ جات میں تاریخ میں پہلی بار تعیناتی سے دہشت گردوں اور افواج پاکستان کے درمیان ایک واضح لکیر نظر آنے لگی تھی۔ فضا خوف سے آلودہ اور باہمی شکوک وشبہات سے بوجھل ہو چکی تھی۔

تین جیپوں پر مشتمل ہمارا قافلہ کرم ایجنسی کے آغاز میں ہی واقع مل چھاؤنی سے گزرتے ہوئے رات گئے صدر مقام پاراچنار پہنچا۔ شب بسری کے بعد صبح کوہ سفید المعروف تورابورا پہاڑ کو عقب میں رکھ کر ہم نے چند تصاویر بنائیں اور شمالی وزیرستان کے لئے روانہ ہوئے۔ میران شاہ میں رات گزارنے کے بعد ہم وانا کے لئے روانہ ہوئے۔ جس کے لئے ہم نے مرکزی شاہراہ کے بجائے میران شاہ، میر علی، رزمک، لدھا، مکین اور کانی گرم کا اندرونی راستہ اختیار کیا۔ ویران اور گہری گھاٹیوں سے گزرتے ہوئے ایک بار بھی احساس نہ ہوا کہ کچھ عرصے بعد یہ علاقہ خاک و خون اور وحشت وخوف کے اندھیرے میں اس طرح غرق ہوگا کہ ہر ذی روح جو اس کی خاک آلود ہوا میں سانس لے گا، اپنی روح وجاں پر گہرے گھاؤ لے کر نکلے گا۔

اگلے چند ماہ قبائلی علاقوں میں موت کا سکوت تھا جیسے ہولناک طوفان کے آنے سے پہلے کی پراسرار خاموشی۔ آزاد فضاؤں میں دشمن زہر گھول چکا تھا۔ لاوا پک چکا تھا، بس پھٹنے کو تھا۔ فی الوقت دونوں اطراف ایک دوسرے پر کھلم کھلا حملہ کرنے سے گریزاں لیکن دل رنجش سے پھٹنے کو تھے۔

صدیوں سے انسان کے اندر چھپے شکاری اور اپنے دفاع کی جبلیات ہوش وحواس پر غالب آتی جا رہی تھیں۔ پاکستان کا قبائلی علاقہ ایک بارود کا ڈھیر تھا بس چنگاری کا منتظر۔ غالباً فروری

2003 کے دوران وانا کے اعظم بازار میں دن دھاڑے پاک فوج کے ایک جوان کو سینے میں گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ پاک فوج نے زخم کھا کر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ فروری میں ہی یونٹ کو حکم ملا کہ حالات میں کشیدگی بڑھنے کے پیش نظر وانا میں سپلائی پوائنٹس قائم کئے جائیں۔ میں نے اپنے نوجوان افسروں میں سے لیفٹیننٹ طیب کا انتخاب کیا۔ اتوار کے روز لیفٹیننٹ طیب نے تمام تر تیاری کے بعد مجھے گھر پر فون کیا اور روانگی کی اجازت طلب کی۔ میں نے طیب سے کہا کہ اگر وہ ویک اینڈ گھر گزارنا چاہتا ہو تو کل علی الصبح روانہ ہو جائے۔ لیفٹیننٹ طیب کا جواب آج بھی میرے کانوں میں گونجتا ہے۔ ''نہیں سر! میں آج ہی جانا چاہتا ہوں۔'' طیب کی شادی کو محض ڈیڑھ سال کا عرصہ ہوا تھا اور اس کی ایک پیاری سی چھ ماہ کی بیٹی تھی۔

طیب نے سات آٹھ گھنٹوں کے سفر کے بعد صوبہ خیبر پختونخوا اور قبائلی علاقہ جات کی سرحد پر واقع شہر ٹانک میں قیام کیا۔ اگلی صبح ایک کانوائے، جس میں انجینئرز کی بھاری گاڑیاں اور سست رفتار مشینری بھی شامل ہو چکی تھی، کو لے کر لیفٹیننٹ طیب عازم سفر ہوا۔ رات کا کھانا کھا کر طیب نے مجھے فون کال کی جو میری اس کے ساتھ آخری گفتگو تھی۔ میں نے اس کو تاکید کی کہ وانا پہنچتے ہی سب سے پہلے مجھے اطلاع کرے۔

شام کے قریب طیب کی شہادت کی اطلاع مل گئی۔ وانا سے 30 میل کے فاصلے پر سروکئی کے مقام پر دہشت گردوں کے اچانک حملے میں طیب اور متعدد جوان جام شہادت نوش کر گئے۔ طیب کا جسد خاکی ہیلی کاپٹر کے ذریعے سی ایم ایچ کوہاٹ لایا گیا۔ میں پہنچا تو طیب خون آلود خاکی وردی میں ابدی نیند سو رہا تھا۔ نوجوان شہید کی گردن پر گولی کا کاری وار نمایاں تھا۔ ٹھوڑی پر سفید پٹی اور گردن اور گال کے بیچ کا حصہ خون آلود تھا۔ دہشت گردی کی سیاہ طویل رات کا آغاز ہو چکا تھا۔ بے چہرہ دشمن نے آنے والے سالوں میں اسلام کے نام پر نہ صرف اسلامی روایات بلکہ مروجہ عالمی جنگی اصولوں کی وہ دھجیاں اڑائیں کہ انسانیت کانپ کر رہ گئی۔

سوشل میڈیا پر لیفٹیننٹ ارسلان عالم ستی کی تصاویر کو ہر پاکستانی کی طرح میں نے بھی فخر و

ملال کے ملے جلے احساسات کے ساتھ دیکھا۔شام گئے کسی نے تابوت میں بند نوجوان ونوخیز شہید کا چہرہ اپ لوڈ کیا تو بے اختیار مجھے لیفٹیننٹ طیب یاد آ گیا۔ وہی سکون، وہی معصومیت اور وہی خون آلود گردن ۔طیب کی میٹ آج پندرہ سال کی ہے۔ارسلان عالم 22 سال کا تھا۔خون کا ایک خراج ہے جو پاکستان ادا کر رہا ہے ۔لہو میں لپٹی عزم واستقلال کی داستان ہے ۔

31 اگست 2017 کو فوجی وردی میں اپنا آخری دن گزارنے کے بعد جب میں جی ایچ کیو سے نکل رہا تھا تو دل ودماغ میں یادوں کا ایک طوفان برپا تھا۔آنکھوں کے کونوں میں آنسو تھے کہ گرنے کو بے تاب تھے ۔آج 23 ستمبر کے دن جبکہ پاک فوج سے میرا تعلق محض رسمی رہ گیا ہے، ارسلان کی شہادت نے گہرے گھاؤ کھرچ ڈالے ہیں۔آنسوؤں کا ایک سیل رواں ہے۔اب جبکہ میں وقت کے دھندلکے میں کھونے جا رہا ہوں۔اپریل 2018 میں میرا بیٹا پاکستان ملٹری اکیڈمی سے انشاء اللہ پاس آؤٹ ہو کر پاک فوج کی صفوں میں شامل ہو گا۔ لیفٹیننٹ ارسلان عالم ستی وقت شہادت ایک چھوٹی سی پوسٹ کی کمان کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ روشنیوں اور رنگوں میں بسے پاک وطن کے آباد وشاداب شہروں اور قصبوں سے میلوں دور، چھوٹی سی پوسٹ پر گرنے والا شہید کا مقدس خون ہم پر قرض ہے۔دور افتادہ سنگلاخ پہاڑوں کے بیچ یہ چھوٹی سی پوسٹ کبھی خالی نہیں ہوگی۔سبز ہلالی پرچم لہراتا رہے گا۔

*****

ہماری دیگر مطبوعات

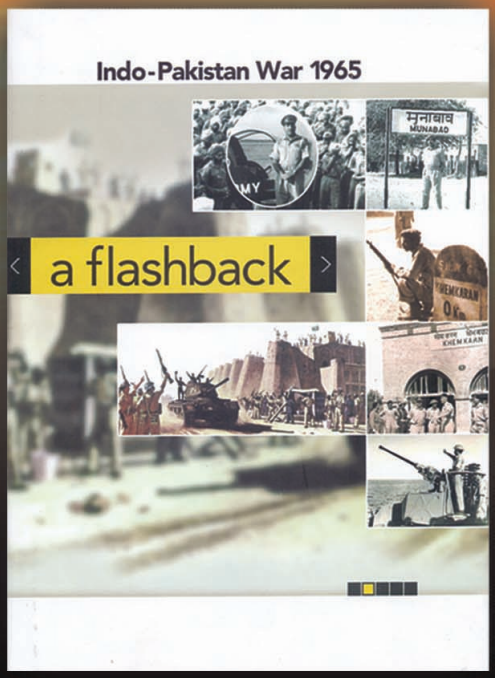

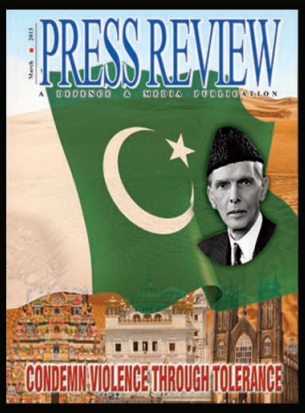

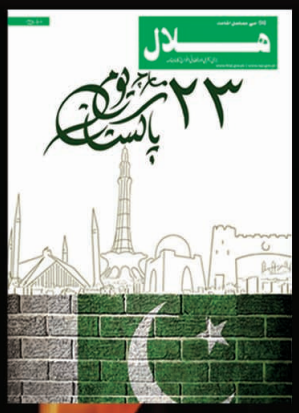

ہلال پبلیکیشنز
انٹر سروسز پبلک ریلیشنز
ہلال روڈ راولپنڈی کینٹ
فون 051 9271617
ای میل: hilalurdu@gmail.com
www.ispr.gov.pk